

برگ آوارہ
حبیب جالب

برگِ آوارہ

حبیب جالب

مکتبہ کارواں، کچہری روڈ، انارکلی، لاہور

اشاعت	پانچویں بار
تاریخ	۱۹۷۷ء
مطبع	کارواں پریس، لاہور
طابع وناشر	چودھری عبدالمجید ایم اے
کتابت	محمد حسین (شاہ)
گردپوش	حنیف رامے
قیمت	۱۵ روپے

احمد ریاض کے نام ——

سرِ آغاز

قسمت پہ ناز ہے تو اسی اعتبار سے
دل کو رہی ہے راہ سدا کوئے یار سے

ایسی غزل کہی نہ کہیں گے تمام عمر
انعام و داد جس پہ ملے شہر یار سے

جس پر تھا اِک ہجوم کبھی اہلِ شوق کا
تنہا گزر رہے ہیں اب اُس رہگزار سے

ترکِ وفا کا دل میں نہ آنے دیا خیال
اس آئینے کو ہم نے بچایا غبار سے

کچھ اور ہو گیا ہے وہ شاعر نہیں رہا
وابستہ ہو گیا جو کسی تاجدار سے

مقدمہ

ایک سال ہونے کو آیا دہلی کی بزمِ سخن میں پاکستان کے ایک جواں سال شاعر حبیب جالب کو دیکھا اور اس کا کلام اس کی زبان سے سُنا۔ اب تک اس کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے اور اس کی صورت آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں نامرادیوں کی ترجمان، کتنا درد، کتنا سوز، کتنی کسک تھی اس کی آواز میں، کتنی تڑپ، کتنا گداز، کتنی دلآویزی تھی اس کے اشعار میں، کانوں تک پہنچتے ہی دل میں اُتر جاتے اور سننے والے کو بے اختیار شاعر کی زندگی کے غم کدوں میں لے جاتے۔ اس کی رودادِ حیات کے منتشر اجزا میں نے اس کے اشعار سے جمع کیے ہیں۔ اس سے زیادہ میں اس کے متعلق اور کچھ نہیں جانتا۔

پچھلے چند سال میں طوفانِ حوادث نے کتنی پُرسکون بستیوں کو انقلاب کا گہوارہ بنا دیا، اور کتنے امن پسند انسانوں کو وطن آوارہ کر دیا۔ خدا جانے کن حالات کی چیرہ دستیوں نے اس جواں سال شاعر کو اس کے مامن سے اُٹھا کر غربت میں پھینک دیا۔ جوان دل کی ساری امنگیں، سارے ولولے سسک سسک کر موت کی گود میں جا سوئے۔ گزری ہوئی دلنواز ساعتوں کی جاں گداز یادوں کے سوا اب کچھ بھی اس کے پاس باقی نہیں رہا۔

مولانا غنیمت نے پنجاب کو "حسن آباد"[1] اور "انتخاب ہفت کشور"[2] کہا تھا۔ لاہور اُسی حسن آباد اور انتخاب ہفت کشور کا دل ہے۔ تہذیب و تمدن کا مرکز، حسن و جمال کا گہوارہ۔ نئی اصطلاح کے مطابق "شہرِ نگاراں" اور "روشنیوں کا شہر"۔ یہاں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی ایک خوش ذوق انسان تمنا کر سکتا ہے۔ یہ حرماں نصیب شاعر بھی اُسی رومانی بستی میں کہیں بستا ہے۔ مگر یہاں کی سب کچھ بھلا دینے والی نشہ آور زندگی، چھوٹ جانے والے دیس کی محبوب یادیں اس سے نہ چھین سکی۔ اس کی زبان سے اس سرزمین کا تذکرہ سُنیے تو دل بے اختیار اُس طرف کھنچنے لگتا ہے۔ فطرت کے دل کش مناظر کا ایک طویل سلسلہ آنکھوں کے سامنے پھیل جاتا ہے اور گوناگوں جذبات کا سمندر موجیں مارنے لگتا ہے۔

پہاڑوں کی وہ مست و شاداب وادی جہاں ہم دلِ نغمہ خواں چھوڑ آئے
وہ سبزہ وہ دریا، وہ پیڑوں کے سائے وہ گیتوں بھری بستیاں چھوڑ آئے
حسیں پنگھٹوں کا وہ چاندی سا پانی وہ برکھا کی رُت وہ سماں چھوڑ آئے

---

[1] نہ دیدم کشورے غارت گر تاب بہ خوبی ہائے حسن آبادِ پنجاب
[2] چہ پنجاب انتخاب ہفت کشور قسم خوردہ بہ آبش آبِ کوثر

وہ حسیں پھول، وہ سبزہ، وہ فسوں سازدیار
وہ مدھر گیت محبت بھرے دریاؤں کے

اس دیس کا رنگ انوکھا تھا، اس دیس کی بات نرالی تھی
نغموں سے بھرے دریا تھے رواں گیتوں سے بھری ہریالی تھی
وہ روشن گلیاں یاد آئیں، وہ پھول وہ کلیاں یاد آئیں
سُندر من چلیاں یاد آئیں، ہر آنکھ مدھر متوالی تھی

چلو دیارِ نغمہ و شباب میں پناہ لیں سمٹ کے آگئی ہیں دل میں سب جہاں کی تلخیاں
چلو غزل کے شہر میں، چلو طرب کے دیس میں چلو نگاہ کو نگاہ کی سنائیں داستاں

ہر گام پر تھے شمس و قمر اُس دیار میں کتنے حسیں تھے شام و سحر اُس دیار میں
وہ باغ؛ وہ بہار، وہ دریا، وہ سبزہ زار نشوں سے کھیلتی تھی نظر اس دیار میں

اس دیار کی راتیں، نغمہ ریز برساتیں
ہر نظر شراب آلود، ہر نفس جواں اپنا

وہ سرسبز و شاداب وادی، وہ گاتی گنگناتی ہوئی ندیاں، وہ گھنیرے درخت، وہ ہرے بھرے کھیت وہ گلپوش سبزہ زار اور وہ فضاییں گونجنے والے الھڑ البیلی معصوم دوشیزاؤں کے مدھر گیت، ایسی رومانی فضا میں سانس لینے والے انسان سے اگر حوادثِ روزگار یہ روح پرور ماحول چھین لیں تو اس کے دل میں کس طرح نشتر نہ ٹوٹیں گے۔ درحقیقت صرف ندیوں کے گیت اور گلپوش وادی ہی اس سے نہیں چھوٹی بلکہ وہ متاعِ عزیز بھی اس سے چھن گئی جسے وہ کبھی غزل، کبھی جانِ غزل، کبھی مہتاب کبھی نزہتِ مہتاب اور کبھی نازشِ خورشید کہتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں تیرا نام نہ لوں میں تجھے ماہتاب کہہ لوں گا

اے نزہتِ مہتاب ترا غم ہے مری زیست
اے نازشِ خورشید ترا غم ہے مری جاں!

یہی سبب ہے کہ جب وہ اپنے دیس کو کہ وہی دیارِ محبوب بھی ہے یاد کرتا ہے تو اس کا لفظ لفظ حسرت

و نامرادی کی تفسیر بلکہ تصویر بن جاتا ہے۔ اس کی رودادِ حیات ایک سیدھا سادہ المیہ ہے، کوئی غیر معمولی، نادر، یا عظیم سانحہ نہیں۔ ہماری سوسائٹی میں اس قسم کی الم انگیز داستانیں خدا جانے ہر روز کتنی بار دہرائی جاتی ہیں۔

اس کے دل میں احساسِ محبت جاگ اُٹھا ہے اور نیاز حریمِ ناز تک جا پہنچا ہے۔ تمنّا کی پذیرائی لطف و کرم سے ہو رہی ہے۔ محبت کا جواب محبت سے مل رہا ہے۔ چھُپ چھُپ کے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ لوگوں کو پتہ لگ گیا ہے اور وہ اس سلسلے کو منقطع کر دینا چاہتے ہیں شاعر اُن دراندازوں کی اور ان کے اِس طرزِ عمل کی مذمت کرتا ہے۔ ہر چند لوگ سدِّ راہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ خطروں میں پڑ کر اور نگہبانوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر اپنی محبوبہ تک پہنچ ہی جاتا ہے:

تُو رنگ ہے، غبار ہیں تیری گلی کے لوگ — تو پھول ہے، شرار ہیں تیری گلی کے لوگ
تُو رونقِ حیات ہے، تو حُسنِ کائنات — اُجڑا ہوا دیار ہیں تیری گلی کے لوگ
تُو پیکرِ وفا ہے مجسّم خلوص ہے — بدنامِ روزگار ہیں تیری گلی کے لوگ

پھر جا رہا ہوں تیرے تبسّم کو لوٹ کے
ہر چند ہوشیار ہیں تیری گلی کے لوگ

محبت کی ناقابلِ فہم زود رنجیاں کہاں نہیں ہوتیں۔ محبت کرنے والوں کے درمیان کبھی کبھی بے بات کی بات پر آزردگی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر آپ ہی آپ صلح ہو جاتی ہے۔ نہ اُس کی کوئی معقول وجہ ہوتی ہے نہ اِس کی۔ غالباً اسی قسم کی کوئی بات ہوئی کہ اُس نے کوئے محبوب میں جانا چھوڑ دیا۔ یہ کھنچے تو وہ کیوں جھکیں۔ کہلا بھیجا کہ ہم ایسے ہی بُرے ہیں اور ہمارے یہاں آنا آپ کے لیے ایسا ننگ و عار ہے تو پھر اس شہر ہی کو کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ نہ آپ یہاں ہوں گے نہ ملنے کا سوال پیدا ہوگا۔ اس نے جواب دیا:

یہ اور بات، تیری گلی میں نہ آئیں ہم
لیکن یہ کیا کہ شہر ترا چھوڑ جائیں ہم

مگر پھر آزردگی کچھ اور بڑھ گئی اور بالآخر اس نے کہہ دیا کہ اچھا اگر تمھاری ایسی ہی خوشی ہے کہ ہم اس شہر سے چلے جائیں تو ہمیں اس میں بھی کوئی عذر نہیں۔ تمھاری یاد تو بہرحال ساتھ جائے گی اور ساتھ رہے گی۔ مگر جانے سے پہلے ایک تمنّا ہے۔ وہ پوری کر دو۔ بس آخری بار

ایک بار ایک غزل سُن لو۔ زندگی میں پھر ایسا موقع کاہے کو آئے گا:

پھر کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے
ہم ترا شہر چھوڑ جائیں گے
دور افتادہ بستیوں میں کہیں
تیری یادوں سے لَو لگائیں گے
شمعِ ماہ و نجوم گل کر کے
آنسوؤں کے دیئے جلائیں گے
آخری بار اک غزل سُن لو
آخری بار ہم سُنائیں گے

غرض ناز و نیاز کے یہ سلسلے ایک مُدّت تک اسی طرح چلتے رہے اور بالآخر وہ وقت آپہنچا کہ ایک بیگانے کی دولت و امارت ان کی محبّت کے درمیان حائل ہو گئی۔ والدین کو لڑکی کی شادی کی فکر ہوئی۔ دولت نے حسن کو خرید لیا۔ محبّت محروم رہ گئی۔ شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ زور شور سے تیاریاں ہو رہی ہیں۔ نامراد چاہنے والا دھک دھک کرنے والے دل کو سنبھالے۔ اس جاں گسل ساعت کا منتظر ہے۔ محبوب کو پا لینے کے تمام امکانات تھوڑی دیر میں ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے۔ اس وقت اس کا دماغ کن خیالات کی آماجگاہ بنا ہُوا تھا۔ یہ خود اسی کی زبان سے سنیئے

متاعِ غیر

آخرِ کار یہ ساعت بھی قریب آپہنچی
تو مری جان کسی اور کی ہو جائے گی
کل تلک میرا مقدر رہتی تری زلف کی شام
کیا قیامت ہے کہ اب غیر کی کہلائے گی
میرے غم خانے میں اب تو نہ کبھی آئے گی

تیری سہمی ہوئی معصوم نگاہوں کی زباں
میری محبوب! کوئی اجنبی کیا سمجھے گا
کچھ جو سمجھا بھی تو اس عین خوشی کے ہنگام
تیری خاموش نگاہی کو حیا سمجھے گا
تیرے بہتے ہوئے اشکوں کو ادا سمجھے گا

میری دم ساز ازمانے سے چلی آتی ہیں
رہنِ غم، وقفِ الم، سادہ دلوں کی آنکھیں
یہ نیا ظلم نہیں پیار کے متوالوں پر
ہم نے دیکھیں یونہی نم سادہ دلوں کی آنکھیں
اور رولیں کوئی دم سادہ دلوں کی آنکھیں

یہ نظم فقط شاعر کے ذاتی تاثرات کا اظہار ہی نہیں بلکہ سماج کی دھاندلی پر ایک دل نشیں اور دھیمی دھیمی طنز بھی ہے جو غیر محسوس طریقے پر قاری کو متاثر کرتی اور اسے سماج کی اس زبردستی کے خلاف بغاوت پر اُکساتی ہے۔

آخر شادی ہو گئی۔ دلہن رخصت ہو رہی ہے۔ شاعر کی نظروں میں دنیا اندھیر ہے۔ ایک طرف محبوبہ کی الم نصیبی کا احساس اس کا کلیجہ مسل رہا ہے۔ ہائے اس ناز پروردہ کا نازک دل کیوں کر اس غم و اندوہ کا متحمل ہوگا۔ دوسری طرف خود اپنے دل سے دھواں اُٹھ رہا ہے۔ اپنی نامرادی کا تصور جاں گسل اور روح فرسا ہے۔ طرح طرح کے خیالات دل میں آرہے ہیں اور اشعار میں ڈھلتے جارہے ہیں

رُخصتی

تُو کلی، نزہتوں، نکہتوں میں پلی
چھوڑ کر شہرِ گل، سُوئے صحرا چلی

وہ شگفتا دیا، تو سحر کی کرن
سوچتا ہوں یہی، کیسے بہلے گا من
دھڑکنوں کو شکوں کیسے بخشے گا دھن
لوگ تجھ کو کہیں گے نصیبوں جلی

تو کلی، نزہتوں، نکہتوں میں پلی
چھوڑ کر شہرِ گل، سُوئے صحرا چلی

تو جہاں سے گزرتی تھی شام و سحر
اب کہاں کہکشاں وہ حسیں رہگزر
شامِ غم چھائی ہے دیکھتا ہوں جدھر
کتنی ویران ہے آج تیری گلی

تُو کلی، نزہتوں، نکہتوں میں پلی
چھوڑ کر شہرِ گل، سُوئے صحرا چلی

کتنی سادہ، کتنی لطیف اور کتنی حسین ہے یہ نظم۔ کتنی رواں دواں اور خوش آہنگ اور پھر کتنی پُر تاثیر، معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے قلم کو اپنے دل کے خون میں ڈبو کر لکھا ہے۔

اس سانحے کے بعد شاعر کی زندگی کا ایک دَور تمام ہو جاتا ہے۔ اب تک صرف غمِ جاناں سے سابقہ تھا، اس کے بعد غمِ دوراں سے مقابلہ ہے۔ ایک غریب الدیار انسان، بیگانے دیس میں، محبت سے محروم، رفاقت کا بھُوکا، کسی سہارے کی تلاش میں سرگرداں ہے اور کوئی سہارا نہیں ملتا۔ اس کی نغمہ سنجی، نوحہ گری میں تبدیل ہو گئی ہے۔ خوش نصیب لوگ مسرور ہیں کہ حوادثِ روزگار نے ایک نئے اور خوش آئند دَور کا آغاز کیا ہے۔ مگر شاعر کا حسّاس دل اور حقیقت نگر آنکھیں خوشی کو ڈھونڈتی ہیں اور نہیں پاتیں۔

گلشن کی فضا دُھواں دُھواں ہے
کہتے ہیں بہار کا سماں ہے
بکھری ہوئی پتیاں ہیں گُل کی
ٹوٹی ہوئی شاخ آشیاں ہے
جس دل سے اُبل رہے تھے نغمے
پہلو میں وہ آج نوحہ خواں ہے

ہم ہی نہیں پائمال تنہا
اپنے دست تباہ اک جہاں ہے

مہتاب صفت لوگ یہاں خاک بسر ہیں
ہم محوِ تماشائے سرِ راہگزر ہیں
حسرت سی برستی ہے در و بام پہ ہر سُو
روتی ہوئی گلیاں ہیں سسکتے ہوئے گھر ہیں

مگر شاعر کی خودداری اور غیرت مندی ہر حالت میں اپنی عزتِ نفس کی محافظ ہے۔ اُسے دولت کے بوجھ سے نہیں جھکایا جا سکتا، محبت کے زور سے رام کیا جا سکتا ہے:

بِک جائیں جو ہر شخص کے ہاتھوں سرِ بازار
ہم یوسفِ کنعاں ہیں نہ ہم لعل و گہر ہیں
ہم لوگ ملیں گے تو محبت سے ملیں گے
ہم نزہتِ مہتاب ہیں، ہم نورِ سحر ہیں

اسی عالم بیتے ہوئے دنوں کی یادیں اکثر اسے گھیر لیتی ہیں اور اس کا دل حسرتوں میں ڈوب ڈوب جاتا ہے۔ وہ مجبور آزادیاں، وہ محبوب کی پرستاریاں، وہ نشاط آگیں خلوتیں، وہ شعر و سخن کی صحبتیں، ایک ایک کر کے سامنے آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں۔ مگر یہ حسرتیں، یہ نامرادیاں ہر روز اس کی صلاحیتوں کو نکھار نکھار کے اسے ایک بہتر فن کار بناتی جا رہی ہیں۔

لوک گیتوں کا نگر یاد آیا — آج پردیس میں گھر یاد آیا
جب چلے آئے چمن زار سے ہم — التفاتِ گلِ تر یاد آیا
ہم زمانے کے ستم بھول گئے — جب ترا لطفِ نظر یاد آیا
تم بھی مسحور تھے اس شب سرِ بزم — اپنے شعروں کا اثر یاد آیا
پھر ہوا دردِ تمنا بیدار — پھر دلِ خاک بسر یاد آیا
ہم جسے بھول گئے تھے جالبؔ
پھر وہی راہ گزر یاد آیا

ہر گام پر تھے شمس و قمر اُس دیار میں — کتنے حسیں تھے شام و سحر اس دیار میں
وہ باغ، وہ بہار، وہ دریا وہ سبزہ زار — نشوں سے کھیلتی تھی نظر اُس دیار میں
ہر چند تھی وہاں بھی خزاں کی اُداس دھوپ — دل پر نہیں تھا غم کا اثر اس دیار میں
محسوس ہو رہا تھا ستارے ہیں گردِ راہ
ہم تھے ہزار خاک بسر اس دیار میں

اور یہ تاثرات آہستہ آہستہ اتنے شدید ہو جاتے ہیں کہ دل بے اختیار دیارِ محبوب کی طرف کھنچنے لگتا ہے۔ ہر چند کہ محبوب سے ملنے کا کوئی امکان نہیں، کوئی امید نہیں، پھر بھی ایک نامعلوم کشش، تمام خطرات سے بے نیاز کر کے "اُدھر" چلنے پر مجبور کرتی ہے:

پھر دل سے آ رہی ہے صدا اُس گلی میں چل — شاید ملے غزل کا پتا، اُس گلی میں چل
وہ بام و در، وہ لوگ، وہ رسوائیوں کے زخم — ہیں سب کے سب عزیز جدا، اُس گلی میں چل
اُس پھول کے بغیر بہت جی اُداس ہے — مجھ کو بھی ساتھ لے کے صبا، اُس گلی میں چل
جالبؔ پکارتی ہیں وہ شعلہ نوائیاں
یہ سرد رُت، یہ سرد ہوا، اُس گلی میں چل

جالب کے اشعار کا مطالعہ کرنے والا اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ جالب کی رودادِ حیات اس کے دماغ کی ایجاد نہیں بلکہ حالات کی پیداوار ہے۔ اس نے سوچ سوچ کر دماغ سے مضامین پیدا نہیں کیے۔ بلکہ اپنے محسوسات اور واقعات کو اشعار کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اس کے اشعار میں تاثیر اور سوز و گداز کا بڑا سبب اس کے جذبات کا خلوص اور صداقت ہے۔ حُسنِ بیان کی دلآویزی نے اس میں اور بھی چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس کی تشبیہات میں تازگی اور استعاروں میں ندرت ہے۔ مصرعوں کی چستی، روانی اور خوش آہنگی، پڑھنے والے پر ایک خوشگوار اثر چھوڑ جاتی ہے۔ سادگی و پُرکاری کے کرشمے جا بجا نظر آتے ہیں۔ بحریں عموماً ایسی اختیار کی ہیں۔ جو مترنم ہونے کے ساتھ غم آگیں خیالات و حالات کے اظہار کے لیے نہایت موزوں ہیں اور شدّتِ تاثیر میں اضافہ کرتی ہیں۔ حسین ترکیبیں اور ان کا اچھوتا پن قدم قدم پر دامنِ نظر کو تھام لیتا ہے۔ مطالعے کے دوران میں یہ تابناکیاں اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتیں اس لیے میں ان کی نشاندہی ضروری نہیں سمجھتا۔ اس زمانے میں جب کہ صحتِ زبان کی طرف سے عام طور پر بے اعتنائی برتی جاتی ہے، یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ "برگِ آوارہ" شروع سے آخر تک زبان کی اغلاط سے پاک ہے۔ پوری کتاب میں دو شعر ایسے نظر آئے جو قواعدِ زبان کی رُو سے محلِ نظر ہیں:

ٹھنڈی آہیں بھرنے والو!
ٹھنڈی آہیں بھر دیکھا ہے

سوئے ہو گھنی زلف کے سائے میں ابھی تک
اے راہ رواں! کیا یہی اندازِ سفر ہے

"برگِ آوارہ" کا اغلاطِ زبان سے پاک ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ لکھنے والا زبان کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہے اور اس کے صحیح استعمال پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ "برگِ آوارہ" کو جالب کی "آپ بیتی" کہنا یقیناً درست ہے۔ جہاں سے کھولیے، جہاں سے پڑھیے، اس کی زندگی کا کوئی نہ کوئی واقعہ سامنے آجاتا ہے۔ اب میں "برگِ آوارہ" سے چند اشعار نقل کرتا ہوں اور اربابِ ذوق کو دعوتِ فکر و نظر دیتا ہوں:

شاید بقیدِ زیست وہ ساعت نہ آسکے
تم داستانِ شوق سنو اور سنائیں ہم

آئے تھے یہاں جن کے تصوّر کے سہارے
وہ چاند، وہ سورج وہ شب و روز کدھر ہیں

بہار آکے چلی بھی گئی مگر جالبؔ
ابھی نگاہ میں وہ لالہ زار پھرتے ہیں

اس گلی میں کیا کھویا، اس گلی میں کیا پایا
تشنہ کام پہنچے تھے، تشنہ کام لوٹ آئے

پھر رہی ہیں آنکھوں میں تیرے شہر کی گلیاں
ڈوبتا ہُوا سورج تیرتے ہُوئے سائے

ہم کو تو داغِ دل کے سوا کچھ نہ مل سکا
ان بستیوں میں پیار کسی کو مگر ملے

اِک عمر رہے منتظرِ عہدِ بہاراں
اک عمر اسیرِ خلشِ خام رہے ہم
اِس پھول کو پانا تو بڑی بات ہے جالبؔ
اس پھول کو چھُونے میں بھی ناکام رہے ہم

اس دیار کی راتیں، نغمہ ریز برساتیں
ہر نظر شراب آلود، ہر نفس جواں اپنا
منزلوں نہیں ملتا کوئی سایۂ دیوار
کس کے پاس جائیں ہم، کون ہے یہاں اپنا
سرزمیں وہ آبے کی ہم سے چھِن گئی جالبؔ
آج تک اسی غم میں دل ہے نوحہ خواں اپنا

کہاں اب اُن کو پکاریں، کہاں گئے وہ لوگ
جنھیں فسونِ طرب، موجِ رنگ و بُو کہیے

اجنبی دیاروں میں پھر رہے ہیں آوارہ
اے غمِ جہاں تو نے یہ بھی دن دکھائے ہیں
تیرے بام و در سے دُور تیری رہگزر سے دور
رات کی سیاہی ہے، تیرگی کے سائے ہیں
اُس نگاہ سے جالب رسم و راہ کی خاطر
ہم نے کم نگاہوں کے ناز بھی اُٹھائے ہیں

یہ تیری توجّہ کا ہے اعجاز کہ مجھ سے
ہر شخص ترے شہر کا برہم ہے مری جاں

کتنی روشن ہے تنہائی جب سے یہ معلوم ہُوا
میرے لیے اپنی پلکوں پر تم بھی دیپ جلاتی ہو

یہ بے درد زمانہ ہم سے تیرا درد نہ چھین سکا
ہم نے دل کی بات کہی ہے تیروں میں تلواروں میں

میں چپ ہوں، ذرا ڈوبتے خورشید سے پوچھو
کس کرب سے، کس حال میں، کس طور کٹا دن
لو آج بھی کم ہو نہ سکی یاس کی ظلمت
لو آج بھی بیکار گیا آس بھرا دن
ظلمت کدۂ زیست میں پھر دیکھیے کب آئے
تیرے لب و رخسار سے شرمایا ہُوا دن

میرے نزدیک جالبؔ اساساً غزل کا شاعر ہے اس لیے میں نے اپنے تاثرات کے اظہار کو صرف اس کی غزل تک محدود رکھا ہے۔ جالبؔ کی غزل کے متعلق دو باتیں خصوصیت کے ساتھ ذکر کے قابل ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے یہاں انفرادیت نمایاں ہے۔ مضامین و خیالات میں بھی اور طرزِ ادا میں بھی۔ اور اس انفرادیت کی وجہ یہی ہے کہ اس کے یہاں جو کچھ ہے حال ہے قال نہیں ہے اور ہے بھی تو برائے نام۔ اس کے اشعار اس کی منظوم آپ بیتی ہیں۔ انفرادیت لچر اور پوچ قسم کی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن جالبؔ کی انفرادیت مستحسن ہے مذموم نہیں۔ آج اُردو کے غزل گو شعرأ کا شمار مشکل ہے، لیکن ان سب کے کلام میں یکسانی پائی جاتی ہے اور اس یکسانی کا سبب یہ ہے کہ وہ اکثر رسمی اور تقلیدی غزل کہتے ہیں۔ نہ خیالات ان کے اپنے ہوتے ہیں نہ طرزِ ادا۔ مقررہ مضامین کو مقررہ سانچوں میں ڈھالتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی ایک قالب یا سانچے سے جو چیزیں نکلیں گی وہ لازماً یکساں ہوں گی۔ خصوصاً جب کہ وہ ایک ہی مادّے سے تیار کی گئی ہوں۔ جالبؔ کا مواد بھی اپنا ہے اور اس مواد کی مناسبت سے سانچا بھی اپنا۔ اس لیے وہ جو کچھ کہتا ہے اس میں انفرادیت جلوہ گر ہوتی ہے۔

دوسرے یہ کہ جالبؔ نے اپنی غزل کو داخلی واردات کے بیان تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے دَور کے سماجی اور سیاسی حالات کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے۔ ان موضوعات پر اس کی طرز پر نظمیں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان نظموں میں بھی جالبؔ کا اپنا انفرادی رنگ نمایاں ہے۔ میں اس مضمون کو برگِ آوارہ " کی سب سے پہلی غزل پر تمام کرتا ہوں:

دل کی بات لبوں پر لاکر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سُنا تھا اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں

بیت گیا ساون کا مہینہ، موسم نے نظریں بدلیں
لیکن ان پیاسی آنکھوں سے اب تک آنسو بہتے ہیں

ایک ہمیں آوارہ کہنا، کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

جن کی خاطر شہر بھی چھوڑا، جن کے لیے بدنام ہوئے
آج وہی ہم سے بیگانے بیگانے سے رہتے ہیں

وہ جو ابھی اس راہگزر سے چاک گریباں گزرا تھا
اس آوارہ دیوانے کو جالبؔ جالبؔ کہتے ہیں

منقول از "ندیم" ڈھاکہ
نومبر ۱۹۶۰ء

(ڈاکٹر) عندلیب شادانی

گر بتو اُفتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رُو برُو
شرح دہم غمِ ترا نکتہ بہ نکتہ مُو بمُو



دل کی بات لبوں پر لا کر اب تک ہم دُکھ سہتے ہیں
ہم نے سُنا تھا اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں

بیت گیا ساون کا مہینہ موسم نے نظریں بدلیں
لیکن ان پیاسی آنکھوں سے اب تک آنسو بہتے ہیں

ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں
دُنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

جن کی خاطر شہر بھی چھوڑا جن کے لیے بدنام ہُوئے
آج وہی ہم سے بیگانے بیگانے سے رہتے ہیں

وہ جو ابھی اس راہ گزر سے چاک گریباں گزرا تھا
اِس آوارہ دیوانے کو جالبؔ جالبؔ کہتے ہیں



آج اس شہر میں کل نئے شہر میں بس اسی لہر میں
اُڑتے پتّوں کے پیچھے اُڑاتا رہا شوقِ آوارگی

اس گلی کے بہت کم نظر لوگ تھے فتنہ گر لوگ تھے
زخم کھاتا رہا مُسکراتا رہا شوقِ آوارگی

کوئی پیغامِ گُل تک نہ پہنچا مگر پھر بھی شام و سحر
نازِ بادِ چمن کے اُٹھاتا رہا شوقِ آوارگی

کوئی ہنس کے مِلے غنچۂ جاں کِھلے چاکِ دل کا سِلے
ہر قدم پر نگاہیں بچھاتا رہا شوقِ آوارگی

دشمنِ جاں فلک، غیر ہے یہ زمیں، کوئی اپنا نہیں
خاک سارے جہاں کی اُڑاتا رہا شوقِ آوارگی



ہم آوارہ گاؤں گاؤں بستی بستی پھرنے والے
ہم سے پریت بڑھا کر کوئی مفت میں کیوں غم کو اپنا لے

یہ بھیگی بھیگی برساتیں، یہ مہتاب یہ روشن راتیں
دل ہی نہ ہو تو جھوٹی باتیں کیا اندھیارے کیا اجیالے

غنچے روئیں کلیاں روئیں رو رو اپنی آنکھیں کھوئیں
چین سے لمبی تان کے سوئیں اس پھلواری کے رکھوالے

درد بھرے گیتوں کی مالا جپتے جپتے جیون گزرا
کس نے سُنی ہیں کون سنے گا دل کی باتیں دل کے نالے



یہ اور بات تیری گلی میں نہ آئیں ہم
لیکن یہ کیا کہ شہر ترا چھوڑ جائیں ہم

مُدّت ہُوئی ہے کوئے بُتاں کی طرف گئے
آوارگی سے دل کو کہاں تک بچائیں ہم

شاید بقیدِ زیست یہ ساعت نہ آسکے
تم داستانِ شوق سُنو اور سُنائیں ہم

بے نُور ہو چکی ہے بہت شہر کی فَضا
تاریک راستوں میں کہیں کھو نہ جائیں ہم

اُس کے بغیر آج بہت جی اُداس ہے
جالبؔ چلو کہیں سے اُسے ڈھونڈ لائیں ہم



پھر کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے
ہم ترا شہر چھوڑ جائیں گے

دُور اُفتادہ بستیوں میں کہیں
تیری یادوں سے لَو لگائیں گے

شمعِ ماہ و نجوم گُل کر کے
آنسوؤں کے دِیے جلائیں گے

آخری بار اِک غزل سُن لو
آخری بار ہم سُنائیں گے

صورتِ موجۂ ہَوا جالبؔ
ساری دُنیا کی خاک اُڑائیں گے



محبّت کی رنگینیاں چھوڑ آئے
ترے شہر میں اِک جہاں چھوڑ آئے

پہاڑوں کی وہ مست و شاداب وادی
جہاں ہم دلِ نغمہ خواں چھوڑ آئے

وہ سبزہ وہ دریا وہ پیڑوں کے سائے
وہ گیتوں بھری بستیاں چھوڑ آئے

حسیں پنگھٹوں کا وہ چاندی سا پانی
وہ برکھا کی رُت وہ سماں چھوڑ آئے

بہت دُور ہم آ گئے اُس گلی سے
بہت دُور وہ آستاں چھوڑ آئے

بہت مہرباں تھیں وہ گلپوش راہیں
مگر ہم انہیں مہرباں چھوڑ آئے

بگولوں کی صورت یہاں پھر رہے ہیں
نشیمن سرِ گلستاں چھوڑ آئے

یہ اعجاز ہے حُسنِ آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

چلے آئے اُن رہگزاروں سے جالب
مگر ہم وہاں قلب و جاں چھوڑ آئے

○

لوک گیتوں کا نگر یاد آیا
آج پردیس میں گھر یاد آیا

جب چلے آئے چمن زار سے ہم
التفاتِ گُلِ تر یاد آیا

تیری بیگانہ نگاہی سرِ شام
یہ ستم تا بہ سحر یاد آیا

ہم زمانے کے ستم بھول گئے
جب ترا لطفِ نظر یاد آیا

تو بھی مسحور تھا اُس شب سرِ بزم
اپنے شعروں کا اثر یاد آیا

پھر ہُوا دردِ تمنّا بیدار
پھر دلِ خاک بسر یاد آیا

ہم جسے بھول گئے تھے جالب
پھر وہی راہ گزر یاد آیا



جاگ اُٹھے سوئے ہُوئے درد تمنّاؤں کے
راستے ذہن میں لہرا گئے اُس گاؤں کے

اِک تری یاد سے اِک تیرے تصوّر سے ہمیں
آ گئے یاد کئی نام حسیناؤں کے

صبح سے شام تلک گرم ہَوا چلتی ہے
دن بہت سخت ہیں تپتے ہُوئے صحراؤں کے

اس کڑی دھوپ میں یاد آتے ہیں تڑپاتے ہیں
ہم کو احسان درختوں کی گھنی چھاؤں کے

وہ حسیں پھول وہ سبزہ وہ فسوں ساز دیار
وہ مدھر گیت محبّت بھرے دریاؤں کے

جانے کس حال میں ہیں، کون بتائے جالبؔ
ارضِ پنجاب میں پودے میری آشاؤں کے



اس دیس کا رنگ انوکھا تھا اس دیس کی بات نرالی تھی
نغموں سے بھرے دریا تھے رواں گیتوں سے بھری ہریالی تھی

اُس شہر سے ہم آجائیں گے اشکوں کے دِیپ جلائیں گے
یہ دَور بھی آنے والا تھا یہ بات بھی ہونے والی تھی

وہ روشن گلیاں یاد آئیں وہ پھول وہ کلیاں یاد آئیں
سندر من چلیاں یاد آئیں ہر آنکھ مدھر متوالی تھی

کس بستی میں آ پہنچے ہم ہر گام پہ ملتے ہیں سَو غم
پھر چل اس نگری میں ہمدم ہر شام جہاں اُجیالی تھی

وہ بام و در وہ راہ گزر دِل خاک بسر جاں خاک بسر
جالبؔ وہ پریشاں حالی بھی کیا خوب پریشاں حالی تھی



ہر گام پر تھے شمس و قمر اُس دیار میں
کتنے حسیں تھے شام و سحر اُس دیار میں

وہ باغ وہ بہار وہ دریا وہ سبزہ زار
نشّوں سے کھیلتی تھی نظر اُس دیار میں

آسان تھا سفر کہ ہر اِک رہگزار پر
ملتے تھے سایہ دار شجر اُس دیار میں

ہر چند تھی وہاں بھی خزاں کی اُداس دُھوپ
دل پر نہیں تھا غم کا اثر اُس دیار میں

محسوس ہو رہا تھا ستارے ہیں گردِ راہ
ہم تھے ہزار خاک بسر اُس دیار میں

جالبؔ یہاں تو بات گریباں تک آ گئی
رکھتے تھے صرف چاکِ جگر اُس دیار میں



پھر دل سے آ رہی ہے صدا اس گلی میں چل
شاید ملے غزل کا پتا اس گلی میں چل

کب سے نہیں ہُوا ہے کوئی شعر کام کا
یہ شعر کی نہیں ہے فضا اس گلی میں چل

وہ بام و در وہ لوگ وہ رسوائیوں کے زخم
ہیں سب کے سب عزیز جُدا، اس گلی میں چل

اُس پھُول کے بغیر بہت جی اُداس ہے
مجھ کو بھی ساتھ لے کے صبا اس گلی میں چل

دنیا تو چاہتی ہے یونہی فاصلے رہیں
دنیا کے مشوروں پہ نہ جا، اس گلی میں چل

بے نور و بے اثر ہے یہاں کی صدائے ساز
تھا اس سکوت میں بھی مزا اس گلی میں چل

جالب پکارتی ہیں وہ شعلہ نوائیاں
یہ سرد رُت، یہ سرد ہوا، اس گلی میں چل



بجلیوں کی یورش سے شاخ شاخ لرزاں ہے
کیا یہی بہاراں ہے کیا یہی گلستاں ہے

آج بھی نِگاہوں سے وحشتیں نہیں جاتیں
آج بھی نِگاہوں میں کائنات ویراں ہے

تیرے گیسوؤں ہی پر میری جاں نہیں موقوف
ذرہ ذرہ ہستی کا آج کل پریشاں ہے

مل ہی جائے گی منزل کٹ ہی جائے گی مشکل
اے مرے نئے ساتھی کس لیے ہراساں ہے



گلشن کی فضا دھواں دھواں ہے
کہتے ہیں بہار کا سماں ہے

بکھری ہوئی پتیاں ہیں گل کی
ٹوٹی ہوئی شاخِ آشیاں ہے

جس دل سے ابھر رہے تھے نغمے
پہلو میں وہ آج نوحہ خواں ہے

ہم ہی نہیں پائمال تنہا!
اے دوست! تباہ اک جہاں ہے

جالبؔ وہ کہاں ہے عشق تیرا
پیارے وہ غزل تری کہاں ہے



مہتاب صفت لوگ یہاں خاک بسر ہیں
ہم محوِ تماشائے سرِ راہ گزر ہیں
حسرت سی برستی ہے درو بام پہ ہر سُو
روتی ہُوئی کلیاں ہیں سِسکتے ہُوئے گھر ہیں
آئے تھے یہاں جن کے تصوّر کے سہارے
وہ چاند، وہ سُورج، وہ شب و روز کدھر ہیں
سوئے ہو گھنی زلف کے سائے میں ابھی تک
اے راہروان کیا یہی اندازِ سفر ہیں
وہ لوگ، قدم جن کے لیے کاہکشاں نے
وہ لوگ بھی اے ہمنفسو ہم سے بشر ہیں
بک جائیں جو ہر شخص کے ہاتھوں سرِ بازار
ہم یوسفِ کنعاں ہیں نہ ہم لعل و گہر ہیں
ہم لوگ ملیں گے تو محبت سے ملیں گے
ہم نزہتِ مہتاب ہیں ہم نورِ سحر ہیں



شہر ویراں اُداس ہیں گلیاں
رہگزاروں سے اُٹھ رہا ہے دُھواں
آتشِ غم میں جل رہے ہیں دیار
گرد آلود ہے رُخِ دَوراں
بستیوں پہ غموں کی یورش ہے
قریہ قریہ ہے وقفِ آہ و فغاں
صبح بے نور، شام بے مایہ
لُٹ گئی دولتِ نگاہ کہاں
پھر رہے ہیں طیُور آوارہ
برق ہر شاخ پر ہے شعلہ فشاں
میری تنہائیوں پہ صورتِ شمع
رو رہا ہے الم نصیب سماں
میرے شانوں سے تیری زلفوں تک
فاصلہ عمر کا ہے میری جاں!



اگر دامن نہیں ان کا میسّر
کسی دیوار ہی سے لگ کے رو لیں

ملے رونے سے فرصت تو کسی شب
ستاروں کی حسیں چھاؤں میں سو لیں

نگاہوں کی زباں کوئی جو سمجھے
سرِ محفل کبھی ہم لب نہ کھولیں

بہت آسان ہو جائے گی منزل
چلو ہم ہی کسی کے ساتھ ہو لیں

کوئی جو آ بسے دل میں تو جالب
کبھی اس گھر کے دروازے نہ کھولیں



اس شہرِ خرابی میں غمِ عشق کے مارے
زندہ ہیں، یہی بات بڑی بات ہے پیارے

یہ ہنستا ہُوا چاند یہ پُر نور ستارے
تابندہ و پائندہ ہیں ذرّوں کے سہارے

حسرت ہے کوئی غنچہ ہمیں پیار سے دیکھے
ارماں ہے کوئی پھول ہمیں دل سے پکارے

ہر صبح مری صبح پہ روتی رہی شبنم
ہر رات مری رات پہ ہنستے رہے تارے

کچھ اور بھی ہیں کام ہمیں اے غمِ جاناں
کب تک کوئی اُلجھی ہُوئی زلفوں کو سنوارے



ہم نے سُنا تھا صحنِ چمن میں کیف کے بادل چھائے ہیں
ہم بھی گئے تھے جی بہلانے اشک بہا کر آئے ہیں
پھول کھلے تو دل مُرجھائے شمع جلے تو جان جلے
ایک تمہارا غم اپنا کر کتنے غم اپنائے ہیں
ایک سُلگتی یاد، چمکتا درد، فروزاں تنہائی
پُوچھ نہ اس کے شہر سے ہم کیا کیا سوغاتیں لائے ہیں
سوئے ہُوئے جو درد تھے دل میں آنسو بن کر بہ نکلے
رات ستاروں کی چھاؤں میں یاد وہ کیا کیا آئے ہیں
آج بھی سورج ڈوب گیا بے نُور افق کے ساگر میں
آج بھی پُھول چمن میں تجھ کو بن دیکھے مرجھائے ہیں
ایک قیامت کا سنّاٹا ایک بلا کی تاریکی
اُن گلیوں سے دُور نہ ہنستا چاند نہ روشن سائے ہیں
پیار کی بولی بول نہ جالبؔ اس بستی کے لوگوں سے
ہم نے سکھ کی کلیاں کھو کر دُکھ کے کانٹے پائے ہیں



جب کوئی کلی صحنِ گلستاں میں کِھلی ہے
شبنم مری آنکھوں میں وہیں تیر گئی ہے

جس کی سرِ افلاک بڑی دُھوم مچی ہے
آشفتہ سری ہے، مری آشفتہ سری ہے

اپنی تو اُجالوں کو ترستی ہیں نِگاہیں
سورج کہاں نِکلا ہے کہاں صبح ہُوئی ہے

ہم کش مکشِ دیر و حرم سے ہیں بہت دُور
انسان کی عظمت پہ نظر اپنی رہی ہے

بِچھڑی ہُوئی راہوں سے جو گزرے ہیں کبھی ہم
ہر گام پہ کھوئی ہوئی اک یاد مِلی ہے

اِک عمر سُنائیں تو حکایت نہ ہو پوری
دو روز میں ہم پر جو یہاں بیت گئی ہے

تم سادہ و معصوم ہو اور ہم ہیں گنہگار
دنیا کی نگاہوں سے کہیں بات چھپی ہے

ہنسنے پہ نہ مجبور کرو، لوگ ہنسیں گے
حالات کی تفسیر تو چہرے پہ لکھی ہے

دیکھا ہے زمانے کو گلے ہم نے لگا کر
سینہ تری دُنیا کا محبّت سے تہی ہے

وہ بھُول گئے ہم کو، انھیں بھول گئے ہم
اے دوست مگر دل میں خلش اب بھی وہی ہے

مل جائیں کہیں وہ بھی تو ان کو بھی سُنائیں
جالبؔ یہ غزل جن کے لیے ہم نے کہی ہے



کبھی تو مہرباں ہو کر بلا لیں
یہ مہوش ہم فقیروں کی دعا لیں

نہ جانے پھر یہ رُت آئے نہ آئے
جواں پھولوں کی کچھ خوشبو چُرا لیں

بہت روئے زمانے کے لیے ہم
ذرا اپنے لیے آنسو بہا لیں

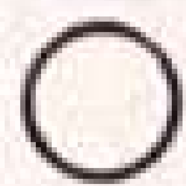
ہم ان کو بھولنے والے نہیں ہیں
سمجھتے ہیں غمِ دوراں کی چالیں

ہماری بھی سنبھل جائے گی حالت
وہ پہلے اپنی زلفیں تو سنبھالیں

نکلنے کو ہے وہ مہتاب گھر سے
ستاروں سے کہو نظریں جھکا لیں

ہم اپنے راستے پر چل رہے ہیں
جنابِ شیخ اپنا راستہ لیں

زمانہ تو یُونہی روٹھا رہے گا
چلو جالبؔ اُنھیں چل کر منا لیں



سونی ہیں آنکھوں کی گلیاں دل کی بستی ویراں ہے
ایک خموشی ایک اندھیرا چاروں جانب رقصاں ہے

کتنی دُور چلا آیا ہوں چھوڑ کے تیری بستی کو
لیکن دل تیری گلیوں میں آج تلک سرگرداں ہے

پھر سورج کے ساتھ ترے ملنے کا امکاں ڈوب گیا
پھر بام و در کی تاریکی دیدہ و دل پر خنداں ہے

پھر ان پیار بھری ندیوں کی یاد میں آنکھیں پُرنم ہیں
پھر اس بچھڑے دیس کے غم میں شہرِ دل و جاں ویراں ہے

جالبؔ آپ اس جانِ غزل کے پیار سے لاکھ انکار کریں
آنکھوں کی پُرسوز چمک سے دل کا درد نمایاں ہے



دل والو کیوں دل سی دولت یوں بیکار لٹاتے ہو
کیوں اس اندھیاری بستی میں پیار کی جوت جگاتے ہو
تم ایسا نادان جہاں میں کوئی نہیں ہے، کوئی نہیں
پھر اُن گلیوں میں جاتے ہو پگ پگ ٹھوکر کھاتے ہو
سُندر کلیو، کومل پھُولو یہ تو بتاؤ یہ تو کہو!
آخر تم میں کیا جادو ہے کیوں من میں بس جاتے ہو
یہ موسم، رِم جِھم کا موسِم، یہ برکھا یہ مست فضا
ایسے میں آؤ تو جانیں، ایسے میں کب آتے ہو!
ہم سے رُوٹھ کے جانے والو اتنا بھید بتا جاؤ
کیوں نت راتوں کو سپنوں میں آتے ہو مَن جاتے ہو
چاند ستاروں کے جُھرمٹ میں پھولوں کی مُسکاہٹ میں
تم چھُپ چھُپ کر ہنستے ہو تم روپ کا مان بڑھاتے ہو
چلتے پھرتے روشن رستے تاریکی میں ڈوب گئے
سو جاؤ اب جالبؔ تم بھی کیوں آنکھیں سُلگاتے ہو



میں چُپ ہوں ذرا ڈوبتے خورشید سے پوچھو
کس کرب سے کس حال میں کس طور کٹا دن

لو آج بھی کم ہو نہ سکی یاس کی ظلمت
لو آج بھی بیکار گیا آس بھرا دن

یہ شہر جہاں ہم ہیں، یہاں کون ہے اپنا
یہ بات ہی کیا کم ہے یہاں بیت گیا دن

یہ کون سی بستی ہے جہاں چاند نہ سُورج
کس درجہ بُری رات ہے، کس درجہ بُرا دن

ظلمت کدۂ زیست میں پھر دیکھیے کب آئے
تیرے لب و رخسار سے شرمایا ہُوا دن

اُس شہر سے دُور آکے جو دن دیکھ رہے ہیں
دشمن کو بھی ایسے تو دکھائے نہ خدا دن



وہ جن کی رفعتوں کے سامنے ہے گردِ آسماں
ترے دیار میں ہیں صورتِ متاعِ رائگاں

یہیں ٹھہر یہیں ٹھہر، میں آ رہا ہوں میری جاں
بُلا رہا ہے اِک ذرا سی دیر کو غمِ جہاں

فریبِ رنگ و بُو نہ کھا ابھی چمن چمن کہاں
ابھی تو شاخ شاخ پر چمک رہی ہیں بجلیاں

چلو دیارِ نغمہ و شباب میں پناہ لیں
سمٹ کے آ گئی ہیں دل میں سب جہاں کی تلخیاں

چلو غزل کے شہر میں چلو طرب کے دیس میں
چلو نگاہ کو نگاہ کی سُنائیں داستاں



کیا کیا لوگ گزر جاتے ہیں رنگ برنگی کاروں میں
دل کو تھام کے رہ جاتے ہیں دل والے بازاروں میں

یہ بیدرد زمانہ ہم سے تیرا درد نہ چھین سکا
ہم نے دل کی بات کہی ہے تیروں میں تلواروں میں

ہونٹوں پر آہیں کیوں ہوتیں آنکھیں نِت دن کیوں روتیں
کوئی اگر اپنا بھی ہوتا اونچے عہدیداروں میں

صدرِ محفل داد جسے دے داد اُسی کو ملتی ہے
ہائے کہاں ہم آن پھنسے ہیں ظالم دنیاداروں میں

رہنے کو گھر بھی مل جاتا جاگِ جگر بھی مل جاتا
جالب تم بھی شعر سناتے جا کے اگر درباروں میں



کٹی اب کٹی منزلِ شامِ غم
بڑھائے چلو پا فگارو قدم
ہمیں سے فروزاں ہے شمعِ وفا
ہمیں نے بھرا ہے محبّت کا دم
کہیں یاس کے حوصلے بڑھ نہ جائیں
کہیں آس کے رُک نہ جائیں قدم
پڑھے گا زمانہ بڑے شوق سے
کیے جاؤ دل کی کہانی رقم
بدل جائے گا دیکھتے دیکھتے
یہ عہدِ خرابی، یہ عہدِ ستم
نکلنے کو ہے آفتابِ سحر
شبِ تار ہے بس کوئی اور دم
مِٹا کر اندھیروں کا نام و نشاں
اُجالوں کی بستی بسائیں گے ہم



شب کو چاند اور دن کو سُورج بن کر روپ دِکھاتی ہو
پل چھِن آنکھوں کی گلیوں میں تم آنچل لہراتی ہو

تم سے جگ اُجیارا سارا روشن بستی بستی ہے
سانجھ سویرے ڈیرے ڈیرے جیون جوت جگاتی ہے

کِتنی روشن ہے تنہائی جب سے یہ معلُوم ہُوا
میرے لیے اپنی پلکوں پر تم بھی دِیپ جلاتی ہو

اے میری انمول غزل یہ بات بھی مجھ تک پہنچی ہے
یارانِ لاہور میں اب تک تم میری کہلاتی ہو

میرؔ ہو غالبؔ ہو یا جالبؔ گیت تمہارے گاتے ہیں
سب کے شعروں میں تم اپنی سُندر چھب دِکھلاتی ہو



اب تیری ضرورت بھی بہت کم ہے مری جاں
اب شوق کا کچھ اور ہی عالم ہے مری جاں
اب تذکرۂ خندۂ گل بار ہے جی پر
جاں وقفِ غمِ گریۂ شبنم ہے مری جاں
رُخ پر ترے بکھری ہوئی یہ زلفِ سیہ تاب
تصویرِ پریشانیٔ عالم ہے مری جاں
یہ کیا کہ تجھے بھی ہے زمانے سے شکایت
یہ کیا کہ تری آنکھ بھی پُرنم ہے مری جاں
ہم سادہ دلوں پر یہ شبِ غم کا تسلّط
مایوس نہ ہو اور کوئی دم ہے مری جاں
یہ تیری توجہ کا ہے اعجاز کہ مجھ سے
ہر شخص ترے شہر کا برہم ہے مری جاں
اے نُزہتِ مہتاب ترا غم ہے مری زیست
اے نازشِ خورشید ترا غم ہے مری جاں



تُو رنگ ہے غبار ہیں تیری گلی کے لوگ
تُو پھول ہے شرار ہیں تیری گلی کے لوگ

تُو رونقِ حیات ہے تو حسنِ کائنات
اُجڑا ہُوا دیار ہیں تیری گلی کے لوگ

تُو پیکرِ وفا ہے مجسّم خلوص ہے
بدنامِ روزگار ہیں تیری گلی کے لوگ

روشن ترے جمال سے ہیں مہر و ماہ بھی
لیکن نظر پہ بار ہیں تیری گلی کے لوگ

دیکھو جو غور سے تو زمیں سے بھی پست ہیں
یوں آسماں شکار ہیں تیری گلی کے لوگ

پھر جا رہا ہوں تیرے تبسّم کو لُوٹ کر
ہر چند ہوشیار ہیں تیری گلی کے لوگ

کھو جائیں گے سحر کے اُجالوں میں آخرش
شمعِ سرِ مزار ہیں تیری گلی کے لوگ

○

یہ اُجڑے باغ ویرانے پُرانے
سناتے ہیں کچھ افسانے پُرانے

اک آہِ سرد بن کر رہ گئے ہیں
وہ بیتے دن وہ یارانے پُرانے

جنوں کا ایک ہی عالم ہو کیونکر
نئی ہے شمع پروانے پُرانے

نئی منزل کی دشواری مُسلّم
مگر ہم بھی ہیں دیوانے پُرانے

ملے گا پیار غیروں ہی میں جالب
کہ اپنے تو ہیں بیگانے پُرانے



شعر ہوتا ہے اب مہینوں میں
زندگی ڈھل گئی مشینوں میں

پیار کی روشنی نہیں ملتی
اِن مکانوں میں اِن مکینوں میں

دیکھ کر دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ
سانپ ہوتے ہیں آستینوں میں

قہر کی آنکھ سے نہ دیکھ ان کو
دل دھڑکتے ہیں آبگینوں میں

آسمانوں کی خیر ہو یا رب!
اِک نیا عزم ہے زمینوں میں

وہ محبت نہیں رہی جالبؔ
ہم صفیروں میں ہم نشینوں میں



اس نے جب ہنس کے نمسکار کیا
مجھ کو انسان سے اوتار کیا

دشتِ غربت میں دلِ ویراں نے
یادِ جمنا کو کئی بار کیا

پیار کی بات نہ پوچھو یارو!
ہم نے کس کس سے نہیں پیار کیا!

کتنی خوابیدہ تمناؤں کو،
اس کی آواز نے بیدار کیا

ہم پجاری ہیں بتوں کے جالب
ہم نے کعبے میں بھی اقرار کیا



ماورائے جہاں سے آئے ہیں
آج ہم خستاں سے آئے ہیں

اس قدر بے رُخی سے بات نہ کر
دیکھ تو ہم کہاں سے آئے ہیں

ہم سے پُوچھو چمن پہ کیا گزری
ہم گزر کر خزاں سے آئے ہیں

راستے کھو گئے ضیاؤں میں
یہ ستارے کہاں سے آئے ہیں

اس قدر تو بُرا نہیں جالب
مل کے ہم اُس جواں سے آئے ہیں



عشق میں نام کر گئے ہوں گے
جو ترے غم میں مر گئے ہوں گے

اب وہ نظریں اِدھر نہیں اُٹھتیں
ہم نظر سے اُتر گئے ہوں گے

کچھ فضاؤں میں اِنتشار سا ہے
اُن کے گیسو بکھر گئے ہوں گے

نور بکھرا ہے رہ گزاروں میں
وہ اِدھر سے گزر گئے ہوں گے

میکدے میں کہ بزمِ جاناں تک
اور جالب کدھر گئے ہوں گے



آج پھر تم نظر نہیں آئے
پھر تمنّا کے پھول مرجھائے

آج پھر سوگوار آنکھوں نے
لالہ و گل پہ اشک برسائے

آج پھر عہدِ غم کے افسانے
میری بے تابیوں نے دُہرائے

اس بھرے شہر میں تمھارا پتا
کس کو معلوم کون بتلائے

کن دیاروں میں کھو گئے ہو تم
ہم ستاروں کی خاک چھان آئے



کون بتائے کون سجھائے کون سے دیس سدھار گئے
ان کا رستہ تکتے تکتے نَین ہمارے ہار گئے

کانٹوں کے دُکھ سہنے میں تسکین بھی تھی آرام بھی تھا
ہنسنے والے بھولے بھالے پھول چمن کے مار گئے

ایک لگن کی بات ہے جیون ایک لگن ہی جیون ہے
پوچھ نہ کیا کھویا کیا پایا کیا جیتے کیا ہار گئے

آنے والی برکھا دیکھیں کیا دکھلائے آنکھوں کو
یہ برکھا برسائے دن تو بِن پریتم بیکار گئے

جب بھی لَوٹے پیا سے لَوٹے پھول نہ پا کر گلشن میں
بھونرے امرت رس کی دُھن میں پل پل سَو سَو بار گئے

ہم سے پوچھو ساحل والو کیا بیتی دکھیاروں پر
کھیون ہارے بیچ بھنور میں چھوڑ کے جب اُس پار گئے



پھول سے ہونٹ چاند سا ماتھا
ہم نے بھی ایک خواب دیکھا تھا

کوئی بات اُن لبوں تک آئی تھی
کوئی غنچہ ضرور چٹکا تھا

ہائے ڈیکوٹ کی مدھر گلیاں
میں کبھی اس طرف سے گزرا تھا

رات صحنِ خیال میں جا لب
اک عجب شوخ رقص فرما تھا



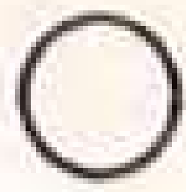
نظر نظر میں لیے تیرا پیار پھرتے ہیں
مثالِ موجِ نسیمِ بہار پھرتے ہیں

ترے دیار سے ذرّوں نے روشنی پائی
ترے دیار سے ہم سوگوار پھرتے ہیں

یہ حادثہ بھی عجب ہے کہ تیرے دیوانے
لگائے دل سے غمِ روزگار پھرتے ہیں

لیے ہوئے ہیں دو عالم کا درد سینوں میں
تری گلی میں جو دیوانہ وار پھرتے ہیں

بہار آکے چلی بھی گئی مگر جالب
ابھی نگاہ میں وہ لالہ زار پھرتے ہیں



پھُول کو دیکھنے سے ایک نظر
کتنے عالم گزر گئے دل پر

یوں بھی بے چینیاں نہیں جاتیں
ہم نے دیکھا خموش بھی رہ کر

شب کی تاریکیوں میں تیرا خیال
جیسے کھو جائے روشنی میں نظر

تیری بدلی ہُوئی نظر توبہ
کتنا گہرا ہے زندگی پہ اثر

اس دیارِ ستم ظریفاں میں
فرصتِ ہاؤ ہُو بہت ہے مگر

قہقہے بے شعور لوگوں کے
کس قدر بار ہیں سماعت پر



شوقِ آوارگی میں کیا نہ ہُوا
ایک تیرا ہی سامنا نہ ہُوا

حرفِ مطلب نہ آسکا لب پر
مطمئن ہیں کوئی خفا نہ ہُوا

اُس کے آنچل کو چھُو رہی ہے صبا
وائے قسمت کہ میں صبا نہ ہُوا

دل میں نوحہ کناں رہا اک غم
گھر کبھی اپنا بے صدا نہ ہُوا

ناخدا تو ہمیں ڈبو دیتا
خیر گزری کہ وہ خدا نہ ہُوا

ہم پہ اِس عہدِ کم نگاہی میں
کون سا جورِ ناروا نہ ہُوا

اب تو ہم خاک ہو چکے جالبؔ
اب ہمارا کوئی ہُوا نہ ہُوا



اس گلی کے لوگوں کو منہ لگا کے پچھتائے
ایک درد کی خاطر کتنے درد اپنائے

تھک کے سو گیا سورج شام کے دھندلکوں میں
آج بھی کئی غنچے پھول بن کے مُرجھائے

ہم ہنسے تو آنکھوں میں تیرنے لگی شبنم
تم ہنسے تو گلشن نے تم پہ پھول برسائے

اس گلی میں کیا کھویا اس گلی میں کیا پایا
تشنہ کام پہنچے تھے تشنہ کام لوٹ آئے

پھر رہی ہیں آنکھوں میں تیرے شہر کی گلیاں
ڈوبتا ہُوا سورج پھیلتے ہُوئے سائے

جالبؔ ایک آوارہ اُلجھنوں کا گہوارہ
کون اس کو سمجھائے کون اس کو سلجھائے



حسرت رہی کوئی تو یہاں دیدہ ور ملے
لیکن تری گلی میں سبھی کم نظر ملے

ایسے بھی آشنا ہیں نہ دیکھا جنھیں کبھی
نا آشنا تھے وہ بھی جو شام و سحر ملے

شاید اِسی لیے ہمیں منزل نہ سکی
جتنے بھی ہم کو لوگ ملے راہبر ملے

لکھی تھیں جن پہ اپنے جنوں کی حکایتیں
آوارگی میں ایسے بھی کچھ بام و در ملے

کیا کیا نظر نظر میں ہوئی گفتگو، نہ پوچھ
مدت کے بعد جب وہ سرِ رہ گزر ملے

ہم کو تو داغِ دل کے سوا کچھ نہ مل سکا
ان بستیوں میں پیار کسی کو مگر ملے

جالبؔ ہوائے لعل و گہر تھی نہ آج ہے
وہ سنگِ در عزیز ہے وہ سنگِ در ملے



اس کوئے ملامت ہی پہ موقوف نہیں ہے
ہر شہر میں آوارہ و بدنام رہے ہم

کس شوق سے بڑھتے رہے ہر شخص کی جانب
ہر شخص سے محروم بہر گام رہے ہم

اِک عمر رہے منتظرِ عہدِ بہاراں
اِک عمر اسیرِ خلشِ خام رہے ہم

ہم کہہ نہ سکے کھُل کے کوئی بات کسی سے
ہر گام پہ لذّت کشِ اِبہام رہے ہم

کیوں اپنا مقدّر نہ ہُوئے عارض و گیسو
اِس فکر میں سوزاں سحر و شام رہے ہم

اس پھُول کو پانا تو بڑی بات ہے جالب
اس پھُول کو چھُونے میں بھی ناکام رہے ہم



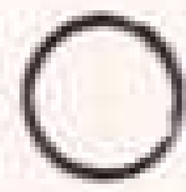
تیری آنکھوں کا عجب طُرفہ سماں دیکھا ہے
ایک عالم تری جانب نگراں دیکھا ہے

کتنے انوار سمٹ آئے ہیں اِن آنکھوں میں
اِک تبسّم ترے ہونٹوں پہ رواں دیکھا ہے

ہم کو آوارہ و بے کار سمجھنے والو!
تم نے کب اُس بتِ کافر کو جواں دیکھا ہے

صحنِ گلشن میں کہ انجم کی طرب گاہوں میں
تم کو دیکھا ہے کہیں، جانے کہاں دیکھا ہے؟

وہی آوارہ و دیوانہ و آشفتہ مزاج
ہم نے جالبؔ کو سرِ کوئے بتاں دیکھا ہے



جی دیکھا ہے مر دیکھا ہے
ہم نے سب کچھ کر دیکھا ہے

برگِ آوارہ کی صورت،
رنگِ خشک و تر دیکھا ہے

ٹھنڈی آہیں بھرنے والو!
ٹھنڈی آہیں بھر دیکھا ہے

تیری زلفوں کا افسانہ!
رات کے ہونٹوں پر دیکھا ہے

اپنے دیوانوں کا عالم،
تم نے کب آ کر دیکھا ہے

انجم کی خاموش فضا میں
میں نے تمھیں اکثر دیکھا ہے

ہم نے اِس بستی میں جالب
جھوٹ کا اُونچا سر دیکھا ہے



تباہیوں پہ بھی دل کو ذرا ملال نہ تھا
خوشا وہ دَور کہ جب زیست کا خیال نہ تھا

کہاں کہاں مری نظروں کو اک تلاش نہ تھی
کہاں کہاں مرے ہونٹوں پہ اک سوال نہ تھا

تری نگاہ سے کوئی گلا نہیں اے دوست
تری نگاہ کے قابل ہمارا حال نہ تھا

کہاں گیا وہ زمانہ کہ جب ہمیں جالبؔ
خیالِ دہر نہ تھا فکرِ ماہ و سال نہ تھا



اُٹھتا ہُوا چمن سے دُھواں دیکھتے چلو
شاخوں پہ رقصِ برقِ تپاں دیکھتے چلو

لُٹتی ہُوئی متاعِ بیاں دیکھتے چلو
کٹتی ہُوئی وفا کی زباں دیکھتے چلو

ہر سُو فروغِ وہم و گماں دیکھتے چلو
مٹتا ہُوا یقیں کا نشاں دیکھتے چلو

اپنے سے کچھ کہو نہ پرائے سے کچھ کہو
دل سوز و دل گداز سماں دیکھتے چلو

جلتا ہُوا کسی کا نشیمن سرِ چمن
خاطر پہ ہو ہزار گراں دیکھتے چلو

توہینِ اہلِ حسن کہ تضحیکِ اہلِ شوق
سب کچھ بجرمِ زیست یہاں دیکھتے چلو

ہر چند ناپسند ہو تحسینِ ناشناس
چُپ چاپ شعریت کا زیاں دیکھتے چلو

اس شہرِ تیرگی میں نگاہِ خموش سے
شب دوستوں کو رقص کُناں دیکھتے چلو



اب نہ وہ غزل اپنی اب نہ وہ بیاں اپنا
راکھ ہو گیا جل کر ہر حسیں گماں اپنا

وہ چمن جسے ہم نے خونِ دل سے سینچا تھا
اس پہ حق جتاتی ہیں آج بجلیاں اپنا

بجلیوں نے دنیا کو کچھ سکون تو بخشا
ہم بنائے لیتے ہیں اور آشیاں اپنا

کچھ دنوں رہی تو ہے داستانِ دل رنگیں
کچھ دنوں رہا تو ہے کوئی ہمزباں اپنا

اس دیار کی راتیں نغمہ ریز برساتیں
ہر نظر شراب آلود ہر نفس جواں اپنا

منزلوں نہیں ملتا کوئی سایۂ دیوار
کس کے پاس جائیں ہم کون ہے یہاں اپنا

سرزمیں دوآبے کی ہم سے چھن گئی جالب
آج تک اِسی غم میں دل ہے نوحہ خواں اپنا



دل ہے اب پہلو میں یوں سہما ہُوا
جیسے کُٹیا میں دیا جلتا ہُوا

اب نہ تیرا غم نہ تیری جستجو
زندگی میں کون یوں تنہا ہُوا

پھر رہا ہوں یوں تری گلیوں سے دور
جیسے کوئی راستہ بھُولا ہُو



جاگنے والو تا بہ سحر خاموش رہو
کل کیا ہوگا کس کو خبر خاموش رہو

کس نے سحر کے پاؤں میں زنجیریں ڈالیں
ہو جائے گی رات بسر خاموش رہو

کس نے سنی ہے اس بستی میں دل کی بات
کس پہ ہُوا آہوں کا اثر خاموش رہو

شاید چُپ رہنے میں عزّت رہ جائے
چُپ ہی بھلی اے اہلِ نظر خاموش رہو

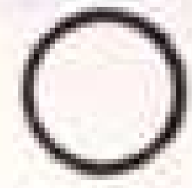
قدم قدم پر پہرے ہیں اِن راہوں میں
دار و رسن کا ہے یہ نگر خاموش رہو

یوں بھی کہاں بے تابیٔ دل کم ہوتی ہے
یوں بھی کہاں آرام، مگر خاموش رہو

شعر کی باتیں ختم ہوئیں اِس عالم میں
کیسا جوشؔ اور کس کا جگرؔ خاموش رہو



غالب و یگانہ سے لوگ بھی تھے جب تنہا
ہم سے ملے نہ ہو گی کیا منزلِ ادب تنہا
فکرِ انجمن کس کو کیسی انجمن پیارے
اپنا اپنا غم سب کو سوچیے تو سب تنہا
سن رکھو زمانے کی کل زبان پر ہوگی
ہم جو بات کرتے ہیں آج زیرِ لب تنہا
اپنی رہنمائی میں کی ہے زندگی ہم نے
ساتھ کون تھا پہلے ہو گئے جو اب تنہا
مہر و ماہ کی صورت مسکرا کے گزرے ہیں
خاکدانِ تیرہ سے ہم بھی روز و شب تنہا
کتنے لوگ آ بیٹھے پاس مہرباں ہو کر
ہم نے خود کو پایا ہے تھوڑی دیر جب تنہا
یاد بھی ہے ساتھ اُن کی اور غمِ زمانہ بھی
زندگی میں اے جالبؔ ہم ہوئے ہیں کب تنہا



اپنوں نے وہ رنج دیے ہیں بیگانے یاد آتے ہیں
دیکھ کے اس بستی کی حالت ویرانے یاد آتے ہیں

اِس نگری میں قدم قدم پہ سر کو جھکانا پڑتا ہے
اس نگری میں قدم قدم پر بُت خانے یاد آتے ہیں

آنکھیں پُر نم ہو جاتی ہیں غربت کے صحراؤں میں
جب اُس رِم جھم کی وادی کے افسانے یاد آتے ہیں

ایسے ایسے درد ملے ہیں نئے دیاروں میں ہم کو
بچھڑے ہُوئے کچھ لوگ پرانے یار انے یاد آتے ہیں

جن کے کارن آج ہمارے حال پہ دنیا ہنستی ہے
کتنے ظالم چہرے جانے پہچانے یاد آتے ہیں

یوں نہ لُٹی تھی گلیوں گلیوں دولت اپنے اشکوں کی
روتے ہیں تو ہم کو اپنے غم خانے یاد آتے ہیں

کوئی تو پرچم لے کر نکلے اپنے گریباں کا جالبؔ
چاروں جانب سنّاٹا ہے دیوانے یاد آتے ہیں



نہ ڈگمگائے کبھی ہم وفا کے رستے میں
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں

کسے لگائے گلے اور کہاں کہاں ٹھہرے
ہزار غنچہ و گل ہیں صبا کے رستے میں

خدا کا نام کوئی لے تو چونک اٹھتے ہیں
ملے ہیں ہم کو وہ رہبر خدا کے رستے میں

کہیں سلاسلِ تسبیح اور کہیں زُنّار
بچھے ہیں دام بہت مدعا کے رستے میں

ابھی وہ منزلِ فکر و نظر کہاں آئی
ہے آدمی ابھی جرم و سزا کے رستے میں

ہیں آج بھی وہی دار و رسن، وہی زنداں
ہر اِک نگاہِ رُموزآشنا کے رستے میں

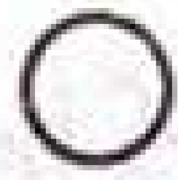
یہ نفرتوں کی فصیلیں، جہالتوں کے حصار
نہ رہ سکیں گے ہماری صدا کے رستے میں

مٹا سکے نہ کوئی سَیلِ انقلاب جنھیں
وہ نقش چھوڑے ہیں ہم نے وفا کے رستے میں

زمانہ ایک سا جالب سدا نہیں رہتا
چلیں گے ہم بھی کبھی سر اُٹھا کے رستے میں



ویراں ہے میری شام، پریشاں مری نظر
اچھا ہُوا کہ تم نہوئے میرے ہم سفر
کوئی صدا نہیں کہ جسے زندگی کہوں
مُدّت سے ہے خموش مرے دل کی رہگزر
لو اب تو شورِ نالہ و فریاد ختم گیا
میرے جنوں پہ ایک زمانے کی تھی نظر
اے میرے ماہتاب کہاں چھپ گیا ہے تو
تجھ بن بجھے بجھے ہیں محبّت کے بام و در
تیرے بغیر کتنی فسردہ ہے بزمِ شعر
اے دوست اب پڑھوں میں غزل کس کو دیکھ کر
میں تیری بے رخی کو بھی سمجھوں گا التفات
پیارے مرے قریب سے اک بار پھر گُزر
جالب مجھے تو اُن کے گریباں کی فکر ہے
جو ہنس رہے ہیں میرے گریباں کے چاک پر



جس کی آنکھیں غزل ہر ادا شعر ہے
وہ مری شاعری ہے مرا شعر ہے

وہ حسیں زلف شب کا فسانہ لیے
وہ بدن نغمگی وہ قبا شعر ہے

وہ تکلّم لہکتی ہُوئی چاندنی
وہ تبسّم لہکتا ہُوا شعر ہے

پھول بھی ہیں بہاریں بھی ہیں گیت بھی
ہم نشیں اُس گلی کی فضا شعر ہے

جس سے روشن تھا دل وہ کرن چھن گئی
اپنے جینے کا اب آسرا شعر ہے

اپنے انداز میں بات اپنی کہو
میرؔ کا شعر تو میرؔ کا شعر ہے

میں جہانِ ادب میں اکیلا نہیں
ہر قدم پر مرا ہم نوا شعر ہے

عرش پر خود کو محسوس ہم نے کیا
جب کسی نے کہا واہ کیا شعر ہے

اک قیامت ہے جالبؔ یہ تنقیدِ نَو
جو سمجھ میں نہ آئے بڑا شعر ہے



جیون مجھ سے میں جیون سے شرماتا ہوں
مجھ سے آگے جانے والو میں آتا ہوں

جن کی یادوں سے روشن ہیں میری آنکھیں
دل کہتا ہے اُن کو بھی میں یاد آتا ہوں

سُر سے سانسوں کا ناتا ہے توڑوں کیسے
تم جلتے ہو کیوں جیتا ہوں کیوں گاتا ہوں

تم اپنے دامن میں ستارے بیٹھ کے ٹانکو
اور میں نئے برن لفظوں کو پہناتا ہوں

جن خوابوں کو دیکھ کے میں نے جینا سیکھا
اُن کے آگے ہر دولت کو ٹھکراتا ہوں

زہر اُگلتے ہیں جب مل کر دنیا والے
میٹھے بولوں کی وادی میں کھو جاتا ہوں

جالبؔ میرے شعر سمجھ میں آ جاتے ہیں
اسی لیے کم رُتبہ شاعر کہلاتا ہوں



ہم کو نظروں سے گرانے والے
ڈھونڈ اب ناز اُٹھانے والے

چھوڑ جائیں گے کچھ ایسی یادیں
روئیں گے ہم کو زمانے والے

رہ گئے نقش ہمارے باقی
مٹ گئے ہم کو مٹانے والے

منزلِ گُل کا پتا دیتے ہیں
راہ میں خار بچھانے والے

ان زمینوں پہ گُہر برسیں گے
ایسے کچھ ابر ہیں چھانے والے

دیکھ وہ صبح کا سورج نکلا
مُسکرا اشک بہانے والے

آس میں بیٹھے ہیں جن کی جالب
وہ زمانے بھی ہیں آنے والے



ناشناسوں کی محفل میں اے نغمہ گر!
فن کو رُسوا نہ کر، فن کو رُسوا نہ کر

کون اِس انجمن میں ہے اہلِ نظر
دولت رائگاں ہے متاعِ ہُنر

کتنے بے نور ہیں آفتاب و قمر
گردشِ روز و شب آ گئے ہم کدھر

کتنی ویران ہیں پیار کی بستیاں
نوحہ گر ہے وفا رہگزر رہگزر

جہل مسند نشیں ہے بصد تمکنت
ہمنشیں کیوں نہ ہو علم کی آنکھ تر

شیخ کی آنکھ میں بھی مروّت نہیں
برہمن بھی محبّت سے ہے بے خبر

میں بھی منصور ہوں میں بھی منصور ہوں
کاٹ دو میرا سر، کاٹ دو میرا سر

دل میں روشن ہے اب تک تری آرزو
اے دیارِ سحر، اے دیارِ سحر



یہ زندگی، گزار رہے ہیں جو ہم.. یہاں
یہ زندگی نصیب ہے لوگوں کو کم یہاں

کوشش کے باوجود بھلائے نہ جائیں گے
ہم پر جو دوستوں نے کیے ہیں کرم یہاں

کہنے کو ہمسفر ہیں بہت اس دیار میں
چلتا نہیں ہے ساتھ کوئی دو قدم یہاں

دیوارِ یار ہو کہ شبستانِ شہر یار
دو پل کو بھی کسی کے نہ سائے میں تھم یہاں

ان بستیوں میں رسمِ وفا ختم ہو چکی
اے چشمِ نم کسی سے نہ کر عرضِ غم یہاں

صد حیف جن کے دم سے پریشاں ہے آدمی
سب کی نگاہ میں ہیں وہی محترم یہاں

نظمیں اُداس اُداس فسانے بُجھے بُجھے
مُدّت سے اشکبار ہیں لوح و قلم یہاں

اے ہم نفس یہی تو ہمارا قصور ہے
کرتے ہیں دھڑکنوں کے فسانے رقم یہاں



آج ہمارے حال پہ ہنس لو شہر کے عزت دارو
کل کو تمہارے حال پہ ہم کو اشک بہانے ہوں گے

ابھی کہاں تکمیل ہوئی ہے اپنے جنوں کی پیارے
اور ابھی لڑکوں کے ہاتھوں پتھر کھانے ہوں گے

اور ابھی توہینِ محبت قدم قدم پہ ہوگی
اور ابھی بیدرد جہاں کے ناز اٹھانے ہوں گے

تم تو کسی کو بھولے سے بھی یاد نہیں آؤ گے
آنے والے عہد کے لب پر اپنے فسانے ہوں گے

تم نے بھی تو محفل میں سب راز کی باتیں کہہ دیں
شہر میں جالبؔ تم سے بھی کم ہی دیوانے ہوں گے



ترے ماتھے پہ جب تک بل رہا ہے
اُجالا آنکھ سے اوجھل رہا ہے

سماتے کیا نظر میں چاند تارے
تصوّر میں ترا آنچل رہا ہے

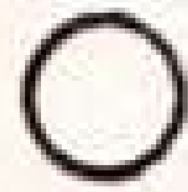
تری شانِ تغافل کو خبر کیا
کوئی تیرے لیے بیکل رہا ہے

شکایت ہے غمِ دوراں کو مجھ سے
کہ دل میں کیوں ترا غم پل رہا ہے

تعجّب ہے ستم کی آندھیوں میں
چراغِ دل ابھی تک جل رہا ہے

لہو روئیں گی مغرب کی فضائیں
بڑی تیزی سے سورج ڈھل رہا ہے

زمانہ تھک گیا، جالبؔ ہی تنہا
وفا کے راستے پر چل رہا ہے



کہیں آہ بن کے لب پر ترا نام آ نہ جائے
تجھے بے وفا کہوں میں وہ مقام آ نہ جائے

ذرا زُلف کو سنبھالو مرا دل دھڑک رہا ہے
کوئی اور طائرِ دل تہہِ دام آ نہ جائے

جسے سُن کے ٹوٹ جائے مرا آرزو بھرا دل
تری انجمن سے مجھ کو وہ پیام آ نہ جائے

وہ جو منزلوں پہ لا کر کسی ہمسفر کو لُوٹیں
اُنہی رہزنوں میں تیرا کہیں نام آ نہ جائے

اِسی فکر میں ہیں غلطاں یہ نظامِ زر کے بندے
جو تمام زندگی ہے وہ نظام آ نہ جائے

یہ مہ و نجوم ہنس لیں مرے آنسوؤں پہ جالب
مرا ماہتاب جب تک لبِ بام آ نہ جائے



کیسی ہوا گلشن میں چلی
مُرجھائی ایک ایک کلی

دل کی کہانی کیا کہیے
اپنی ہی آگ میں شمع جلی

اُس لَٹ کا اُلجھاؤ کیا
ایک بلا تو سر سے ٹلی

دُنیا نے وہ درد دیے
بھول گئے ہم ان کی گلی

بول کے جالبؔ قدر نہ کھو
اس ماحول میں چُپ ہی بھلی



نہ وہ ادائے تکلّم نہ احتیاطِ زباں
مگر یہ ضد کہ ہمیں اہلِ لکھنؤ کہیے

نہ دل میں رقصِ غزل ہے نہ دھڑکنوں کے گیت
اُجڑ گیا ہے، جسے شہرِ آرزو کہیے

کہاں اب اُن کو پکاریں، کہاں گئے وہ لوگ
جنھیں فسونِ طرب موجِ رنگ و بُو کہیے

غزل کی بات جو کرتا ہے کم نظر نقّاد
اسے بھی شیخ کا اندازِ گفتگو کہیے

ادب کا آپ ہی تنہا نہ سانحہ دیں جالب
کہے جو آپ کو "تُم"، آپ اس کو "تُو" کہیے



بھلا بھی دے اُسے جو بات ہو گئی پیارے
نئے چراغ جلا رات ہو گئی پیارے

تری نگاہِ پشیماں کو کیسے دیکھوں گا
کبھی جو تجھ سے ملاقات ہو گئی پیارے

نہ تیری یاد، نہ دنیا کا غم، نہ اپنا خیال
عجیب صورتِ حالات ہو گئی پیارے

اُداس اُداس ہیں شمعیں بجھے بجھے ساغر
یہ کیسی شامِ خرابات ہو گئی پیارے

کبھی کبھی تیری یادوں کی سانولی رُت میں
بہے جو اشک تو برسات ہو گئی پیارے

وفا کا نام نہ لے گا کوئی زمانے میں
ہم اہلِ دل کو اگر مات ہو گئی پیارے

تمھیں تو ناز بہت دوستوں پہ تھا جالب
الگ تھلگ سے ہو، کیا بات ہو گئی پیارے



درخت سُوکھ گئے رُک گئے ندی نالے
یہ کس نگر کو روانہ ہُوئے گھروں والے

کہانیاں جو سناتے تھے عہدِ رفتہ کی
نشاں وہ گردشِ ایّام نے مٹا ڈالے

میں شہر شہر پھرا ہوں اسی تمنّا میں
کسی کو اپنا کہوں کوئی مجھ کو اپنا لے

صدا نہ دے کسی مہتاب کو اندھیروں میں
لگا نہ دے یہ زمانہ زبان پر تالے

کوئی کرن ہے یہاں تو کوئی کرن ہے وہاں
دل و نگاہ نے کس درجہ روگ ہیں پالے

ہمیں یہ اُن کی نظر ہے ہمیں پہ اُن کا کرم
یہ اور بات یہاں اور بھی ہیں دل والے

کچھ اور تجھ پہ کھُلیں گی حقیقتیں جالب
جو ہو سکے تو کسی کا فریب بھی کھا لے



بڑھائیں گے نہ کبھی ربط ہم بہاروں سے
ٹپک رہا ہے لہو اب بھی شاخساروں سے

کہیں تو اپنی محبت پہ حرف آتا ہے
کچھ ایسے داغ بھی ہم کو ملے ہیں یاروں سے

نگاہِ دہر میں ذرّے سہی مگر ہم لوگ
ضیا کی بھیک نہیں مانگتے ستاروں سے

وہ داستاں ہیں کہ دہرائے گی جسے دنیا
وہ بات ہیں جو سُنی جائے گی نگاروں سے

ہمارے نام سے ہے آشنا چمن سارا
سخن کی داد ملی ہے ہمیں ہزاروں سے

فضا نہیں ہے ابھی کھُل کے بات کہنے کی
بدل رہے ہیں زمانے کو ہم اشاروں سے

نہ چھوڑنا کبھی طوفاں میں آس کی پتوار
یہ آ رہی ہے صدا دم بدم کناروں سے

جہاں میں آج بھی محفوظ ہیں وہی نغمے
محبتوں میں جو اُبھرے ہیں دل کے تاروں سے

بزرگ بیٹھ کے لکھتے تھے عرش پر جا کب
اُٹھائی بات مگر ہم نے رہگزاروں سے



غزلیں تو کہی ہیں کچھ ہم نے اُن سے نہ کہا احوال تو کیا
کل مثلِ ستارہ اُبھریں گے، ہیں آج اگر پامال تو کیا

جینے کی دعا دینے والے یہ راز تجھے معلوم کہاں
تخلیق کا اک لمحہ ہے بہت، بیکار جیے سو سال تو کیا

سکّوں کے عوض جو بک جائے وہ میری نظر میں حسن نہیں
اے شمعِ شبستانِ دولت! تُو ہے جو پری تمثال تو کیا

ہر پھُول کے لب پر نام مرا، چرچا ہے چمن میں عام مرا
شہرت کی یہ دولت کیا کم ہے گر پاس نہیں ہے مال تو کیا

ہم نے جو کیا محسوس کہا جو درد ملا ہنس ہنس کے سہا
بھُولے گا نہ مستقبل ہم کو نالاں ہے جو ہم سے حال تو کیا

ہم اہلِ محبت پالیں گے اپنے ہی سہارے منزل کو
یارانِ سیاست نے ہر سُو پھیلائے ہیں رنگیں جال تو کیا

دنیائے ادب میں لے جالبؔ اپنی بھی کوئی پہچان تو ہو
اقبالؔ کا رنگ اُڑانے سے تُو بن بھی گیا اقبال تو کیا



نہ کلیوں میں رنگت نہ پھولوں میں باس
بہار آئی پہنے خزاں کا لباس

گھنی چھاؤں میں دو گھڑی بیٹھ لو
کڑی دھوپ میں جاؤ گے کس کے پاس

ستارو یونہی جگمگاتے رہو
رفیقو کہیں ٹوٹ جائے نہ آس



شہر سے بستی سے ویرانے سے جی گھبرا گیا
اے جنوں تیرے ہر افسانے سے جی گھبرا گیا

اِک مکمل خامشی اِک بیکراں گہرا سکوت
آج صحرا کا بھی دیوانے سے جی گھبرا گیا

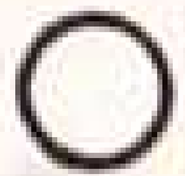
پھر گئے جالب نگاہوں میں کئی اُجڑے چمن
موسِم گل کا خیال آنے سے جی گھبرا گیا



اُٹھ گیا ہے دلوں سے پیار یہاں
کتنے بے نور ہیں دیار یہاں

روشنی روشنی، حیات حیات،
ہر طرف ہے یہی پکار یہاں

راستہ کیا سُجھائی دے اے دوست
جَہل ہے شمعِ رہگزار یہاں



اجنبی دیاروں میں پھر رہے ہیں آوارہ
اے غمِ جہاں تُو نے یہ بھی دن دکھائے ہیں

تیرے بام و در سے دور تیرے رہگزر سے دور
رات کی سیاہی ہے تیرگی کے سائے میں

اُس نگاہ سے جالب رسم و راہ کی خاطر
ہم نے کم نگاہوں کے ناز بھی اُٹھائے ہیں



حُسن کا ہم نے کیا چرچا بہت
حُسن کے ہاتھوں ہُوئے رسوا بہت

موجِ نکہت اپنی قسمت میں نہ تھی
دُور سے اُس پھول کو دیکھا بہت

وہ مِلا تھا راہ میں اک شام کو
پھر اُسے میں نے یہاں ڈھونڈا بہت



میں بھی ہوں تری طرح سے آوارہ و بیکار
اُڑتے ہُوئے پتّے مجھے ہمراہ لیے چل



مرا قصور کہ میں ان کے ساتھ چل نہ سکا
وہ تیز گام مرا انتظار کیوں کرتے



کسے خبر تھی ہمیں راہبر ہی لُوٹیں گے
بڑے خلوص سے ہم کارواں کے ساتھ رہے



ہم اُن نجُوم کی تابش بھی چھین سکتے ہیں
بنا دیا ہے جنھیں فخرِ آسماں ہم نے



ابھی اے دوست ذوقِ شاعری ہے وجہِ رسوائی
تری بستی میں ہم پر اور بھی الزام آئیں گے

اگر اب بھی ہمارا ساتھ تو اے دل نہیں دے گا
تو ہم اس شہر میں تجھ کو اکیلا چھوڑ جائیں گے



خامشی سے ہزار غم سہنا
کتنا دُشوار ہے غزل کہنا

دجلہ بہ دجلہ یَم بہ یَم چشمہ بہ چشمہ جُو بہ جُو

شہرِ دہلی

دیارِ داغ و بیخود شہرِ دہلی چھوڑ کر تجھ کو
نہ تھا معلوم یوں روئے گا دل شام و سحر تجھ کو
کہاں ملتے ہیں دُنیا کو کہاں ملتے ہیں دنیا میں
ہُوئے تھے جو عطا اہلِ سخن اہلِ نظر تجھ کو
تجھے مرکز کہا جاتا تھا دنیا کی نگاہوں کا
محبت کی نظر سے دیکھتے تھے سب نگر تجھ کو
بقولِ میر اوراقِ مصوّر تھے ترے کوچے
مگر ہائے زمانے کی لگی کیسی نظر تجھ کو
نہ بھولے گا ہماری داستاں تو بھی قیامت تک
دلائیں گے ہماری یاد تیرے رہ گزر تجھ کو
جو تیرے غم میں بہتا ہے وہ آنسو رشکِ گوہر ہے
سمجھتے ہیں متاعِ دیدہ و دل دیدہ ور تجھ کو
میں جالبؔ دہلوی کہلا نہیں سکتا زمانے میں
مگر سمجھا ہے میں نے آج تک اپنا ہی گھر تجھ کو

لائل پور

لائل پور اک شہر ہے جس میں دل ہے مرا آباد
دھڑکن دھڑکن ساتھ رہے گی اس بستی کی یاد
میٹھے بولوں کی وہ نگری گیتوں کا سنسار
ہنستے بستے ہائے وہ رستے نغمہ ریز دیار
وہ گلیاں وہ پھول وہ کلیاں رنگ بھرے بازار
میں نے ان گلیوں پھولوں کلیوں سے کیا ہے پیار
برگِ آوارہ میں بکھری ہے جس کی روداد
لائل پور اک شہر ہے جس میں دل ہے مرا آباد

کوئی نہیں تھا کام مجھے پھر بھی تھا کتنا کام
ان گلیوں میں پھرتے رہنا دن کو کرنا شام
گھر گھر میرے شعر کے چرچے گھر گھر میں بدنام
راتوں کو دہلیزوں ہی پر کر لینا آرام
دُکھ سہنے میں چپ رہنے میں دل تھا کتنا شاد
لائل پور اک شہر ہے جس میں دل ہے مرا آباد

میں نے اس نگری میں رہ کر کیا کیا لکھے گیت
جن کے کارن لوگوں کے من میں ہے میری پریت
ایک لگن کی بات ہے، جیون کیسی ہار اور جیت
سب سے مجھ کو پیار ہے جالبؔ سب ہیں میرے میت
داد تو ان کی یاد ہے مجھ کو بھول گیا بے داد
لائل پور اک شہر ہے جس میں دل ہے مرا آباد

متاعِ غیر

آخرِ کار یہ ساعت بھی قریب آپہنچی
تو مری جان کسی اور کی ہو جائے گی
کل تلک میرا مقدر تھی تری زلف کی شام
کیا تغیر ہے کہ اب غیر کی کہلائے گی
میرے غم خانے میں تو اب نہ کبھی آئے گی

تیری سہمی ہوئی معصوم نگاہوں کی زباں
میری محبوب کوئی اجنبی کیا سمجھے گا
کچھ جو سمجھا بھی تو اس عینِ خوشی کے ہنگام
تیری خاموش نگاہی کو حیا سمجھے گا
تیرے بہتے ہوئے اشکوں کو ادا سمجھے گا

میری دم ساز زمانے سے چلی آتی ہیں
رہنِ غم وقفِ الم سادہ دلوں کی آنکھیں

یہ نیا ظلم نہیں پیار کے متوالوں پہ
ہم نے دیکھیں یونہی نم سادہ دلوں کی آنکھیں
اور رو لیں کوئی دم سادہ دلوں کی آنکھیں

رخصتی

تو کلی نزہتوں نکہتوں میں پلی
چھوڑ کر شہرِ گل سُوئے صحرا چلی

وہ سُلگتا دیا تو سحر کی کرن
سوچتا ہُوں یہی کیسے بہلے گا من
دھڑکنوں کو سکوں کیسے بخشے گا دھن
لوگ تجھ کو کہیں گے نصیبوں جلی
تو کلی نزہتوں نکہتوں میں پلی
چھوڑ کر شہرِ گل سُوئے صحرا چلی

تو جہاں سے گزرتی تھی شام و سحر
اب کہاں کہکشاں وہ حسیں رہگزر
شامِ غم چھائی ہے دیکھتا ہوں جدھر
کتنی ویران ہے آج تیری گلی
تو کلی نزہتوں نکہتوں میں پلی
چھوڑ کر شہرِ گل سوئے صحرا چلی

رخصتی کا گیت

جب تو جائے گی گھر اپنے
یاد آئیں گے سندر سپنے
دھڑکن لگ جائے گی بپچنے
بیتی برساتوں کی مالا
جادوگر راتوں کی مالا

بیٹھے بیٹھے کھو جائے گی
خاموشی کے صحراؤں میں
اک ہلچل سی مچ جائے گی
سہمی سہمی آشاؤں میں

ناتھ آئیں گے پیار جتانے
روٹھی ہوئی رادھا کو منانے
دل کا درد کوئی کیا جانے

سونے کی دنیا میں رہ کر
پیلی پیلی ہو جائے گی
بھیگی بھیگی سی آنکھوں میں
پل چھن سرسوں لہرائے گی

پیڑوں کی وہ ٹھنڈی چھاؤں
سندر سکھیاں پنگھٹ گاؤں
چھن چھن پائل ننگے پاؤں

حسبِ فرمائش

میں تجھے پھُول کہوں اور کہوں بھونروں سے
"آؤ اس پھُول کا رس چُوس کے ناچو جھُومو"
میں تجھے شمع کہوں اور کہوں "پروانو!
آؤ اِس شمع کے ہونٹوں کو خوشی سے چُومو"

میں تری آنکھ کو تشبیہہ دوں میخانے سے
اور خود زہرِ جُدائی کا طلب گار رہوں
غیر سوئے تری زلفوں کی گھنی چھاؤں میں
اور میں چاندنی راتوں میں فقط شعر کہوں

مجھ سے یہ تیرے قصیدے نہ لکھے جائیں گے
مجھ سے تیرے لیے غزلیں نہ کہی جائیں گی
یاد میں تیری میں سُلگا نہ سکوں گا آنکھیں
سختیاں درد کی مجھ سے نہ سہی جائیں گی

شہر میں ایسے مصوّر ہیں جو سکّوں کے عوض
حسن میں لیلیٰ و عذرا سے بڑھا دیں گے تجھے
طول دے کر تری زلفوں کو شبِ غم کی طرح
فن کے اعجاز سے ناگن سی بنا دیں گے تجھے!

تجھ کو شہرت کی ضرورت ہے محبّت کی مجھے
اے حسینہ تری منزل مری منزل ہی نہیں
ناچ گھر تیری نگاہوں میں ہیں رقصاں لیکن
اس تعیّش کی تمنّا بھی مرے دل میں نہیں

دیکھ کر غیر کے پہلو میں تجھے رقص کناں
بھیگ جاتی ہے مری آنکھ سرِشکِ غم سے
مجھ کو برسوں کی غلامی کا خیال آتا ہے
جس نے اندازِ وفا چھین لیا ہے ہم سے

مجھ کو بھونرا نہ سمجھ، مجھ کو پتنگا نہ سمجھ
مجھ کو انسان سمجھ میری صداقت سے نہ کھیل
تیری تفریح کا ساماں نہ بنوں گا ھرگز
میری دُنیا ہے یہی میری محبت سے نہ کھیل

کافی ہاؤس

دن بھر کافی ہاؤس میں بیٹھے کچھ دُبلے پتلے نقّاد
بحث یہی کرتے رہتے ہیں سُست ادب کی ہے رفتار
صرف ادب کے غم میں غلطاں چلنے پھرنے سے لاچار
چہروں سے ظاہر ہوتا ہے جیسے برسوں کے بیمار

اُردو ادب میں ڈھائی ہیں شاعر میرؔ و غالبؔ آدھا جوشؔ
یا اک آدھ کسی کا مصرعہ یا اقبالؔ کے چند اشعار
یا پھر نظم ہے اک چوہے پر حامدؔ مدنی کا شہکار
کوئی نہیں ہے اچھا شاعر کوئی نہیں افسانہ نگار

منٹو کرشن ندیم اور بیدی ان میں جان تو ہے لیکن
عیب یہ ہے ان کے ہاتھوں میں کُند زباں کی ہے تلوار
عالی افسر، انشا بابو، ناصر میر کے برخوردار
فیض نے جو اب تک لکھا ہے کیا لکھا ہے سب بیکار

ان کو ادب کی صحت کا غم مجھ کو ان کی صحت کا
یہ بیچارے دکھ کے مارے جینے سے ہیں کیوں بیزار
حسن سے وحشت عشق سے نفرت اپنی ہی صورت سے پیار
خندۂ گل پر ایک تبسم گریۂ شبنم سے انکار

نئی پود

ریستوراں میں بیٹھو اور کانٹے سے کھانا کھاؤ
اُلجھے اُلجھے شعر کہو ذہنوں کو خوب اُلجھاؤ
میر کے مصرعے آگے رکھ کر غزلیں کہتے جاؤ
خود کو پورا، میر کو آدھا ہی شاعر بتلاؤ
اور پھر نئی پود کہلاؤ

ٹیبل پہ جو بات کرو بس لکھتے جاؤ یارو
اور پھر اس کو ماہِ نو کے ماتھے پر دے مارو
سب تم کو فن کار کہیں تم رُوپ کچھ ایسا دھارو
مکتب کے لڑکوں کو اپنی نظمیں یاد کراؤ
اور پھر نئی پود کہلاؤ

اربابِ ذوق

گھر سے نکلے کار میں بیٹھے، کار سے نکلے دفتر پہنچے
دن بھر دفتر کو ٹرخایا
شام کا جب اندھیارا چھایا
محفل میں ساغر چھلکایا
پھول پھول بھونرا لہرایا رات کے ایک بجے گھر پہنچے
گھر سے نکلے کار میں بیٹھے کار سے نکلے دفتر پہنچے

غالب سے ہے ان کو رغبت
میر سے بھی کرتے ہیں اُلفت
اور تخلص میں ہے عظمت
گھر اقبال کے کھانے دعوت چھوٹی عمر میں اکثر پہنچے
گھر سے نکلے کار میں بیٹھے کار سے نکلے دفتر پہنچے

حلقے میں اتوار منانا
ان کا ہے انداز پرانا
نئی ادائیں نیا زمانا
منٹو کا سُننے افسانا اکثر پہنے نیکر پہنچے
گھر سے نکلے کار میں بیٹھے کار سے نکلے دفتر پہنچے

ناک پہ چشمہ سا اٹکائے
گردن میں ٹائی لٹکائے
اِنگلش لٹریچر کو کھائے
اُردو لٹریچر پہ ہائے کالج دینے لیکچر پہنچے
گھر سے نکلے کار میں بیٹھے کار سے نکلے دفتر پہنچے

روئے بھگت کبیر

پوچھ نہ کیا لاہور میں دیکھا ہم نے میاں نظیر
پہنیں سُوٹ انگریزی بولیں اور کہلائیں میر
چودھریوں کی مُٹھی میں ہے شاعر کی تقدیر
روئے بھگت کبیر

اک دُوجے کو جاہل سمجھیں نٹ کھٹ بدھی وان
میٹرو میں جو چائے پلائے بس وہ باپ سمان
سب سے اچھا شاعر وہ ہے جس کا یار مُدیر
روئے بھگت کبیر

سڑکوں پر بھوکے پھرتے ہیں شاعر موسیقار
ایکٹرسوں کے باپ لیے پھرتے ہیں موٹر کار
فلم نگر تک آپہنچے ہیں سید پیر فقیر
روئے بھگت کبیر

لال دین کی کوٹھی دیکھی رنگ بھی جس کا لال
شہر میں رہ کر خوب اڑائے دہقانوں کا مال
اور کہے اجداد نے بخشی مجھ کو یہ جاگیر
روئے بھگت کبیر

جس کو دیکھو لیڈر ہے اور جس سے ملو وکیل
کسی طرح بھرتا ہی نہیں ہے پیٹ ہے ان کا جھیل
مجبوراً سننا پڑتی ہے ان سب کی تقریر
روئے بھگت کبیر

محفل سے جو اُٹھ کر جائے کہلائے وہ بور
اپنی مسجد کی تعریفیں باقی جُوتے چور
اپنا جھنگ بھلا ہے پیارے جہاں ہماری ہیر
روئے بھگت کبیر

بھئے کبیر اُداس

اک پٹڑی پر سردی میں اپنی تقدیر کو روئے
دُوجا زلفوں کی چھاؤں میں سکھ کی سیج پہ سوئے
راج سنگھاسن پر اِک بیٹھا اور اک اس کا داس
بھئے کبیر اُداس

اُونچے اُونچے ایوانوں میں مُورکھ حکم چلائیں
قدم قدم پر اس نگری میں پنڈت دھکے کھائیں
دھرتی پر بھگوان بنے ہیں دھن ہے جن کے پاس
بھئے کبیر اُداس

گیت لکھائیں پیسے نا دیں فلم نگر کے لوگ
ان کے گھر باجے شہنائی لیکھک کے گھر سوگ
گائک سُر میں کیوں کر گائے کیوں نا کاٹے گھاس
بھئے کبیرؔ اُداس

کل تک تھا جو حال ہمارا حال وہی ہے آج
جالبؔ اپنے دیس میں سکھ کا کال وہی ہے آج
پھر بھی موچی گیٹ پہ لیڈر روز کریں بکواس
بھئے کبیرؔ اُداس

یہ وزیرانِ کرام

کوئی ممنونِ فرنگی کوئی ڈالر کا غلام
دھڑکنیں محکوم ان کی لب پہ آزادی کا نام
ان کو کیا معلوم کس عالم میں رہتے ہیں عوام
یہ وزیرانِ کرام

ان کو فرصت ہے بہت اونچے امیروں کے لیے
ان کے ٹیلیفون قایم ہیں سفیروں کے لیے
وقت ان کے پاس کب ہے ہم فقیروں کے لیے
چھو نہیں سکتے انھیں ہم اِن کا اونچا ہے مقام
یہ وزیرانِ کرام

صبح چائے ہے یہاں تو شام کھانا ہے وہاں
کیوں نہ ہوں مغرور چلتی ہے میاں ان کی دکاں
جب یہ چاہیں ریڈیو پر جھاڑ سکتے ہیں بیاں
ہم ہیں بیدل، کار پر یہ، کس طرح ہوں ہمکلام
یہ وزیرانِ کرام

قوم کی خاطر اسمبلی میں یہ مر جاتے بھی ہیں
قوتِ بازو سے اپنی بات منواتے بھی ہیں
گالیاں دیتے بھی ہیں اور گالیاں کھاتے بھی ہیں
یہ وطن کی آبرو ہیں، کیجیے ان کو سلام
یہ وزیرانِ کرام

ان کی محبوبہ وزارت داشتائیں کرسیاں
جان جاتی ہے تو جائے پر نہ جائیں کرسیاں
دیکھیے یہ کب تلک یوں ہی چلائیں کرسیاں
عارضی ان کی حکومت عارضی ان کا قیام
یہ وزیرانِ کرام

مشاعرہ

ابھی جو پاس سے گزری ہے خاک اُڑاتی ہوئی
یہی وہ کار تھی جس میں وہ لوگ آئے تھے
حضور آپ ہی جالب ہیں، آپ کی خاطر
تمام شہر میں دیوانہ وار گھومے ہیں،
کسی طرح سے کہیں آپ کا سُراغ ملے
حضور ہم نے بگولوں کے پاؤں چومے ہیں
ابھی جو پاس سے گزری ہے خاک اُڑاتی ہوئی
مشاعرے میں اسی کار سے گیا تھا میں

ہم دیکھتے ہیں

۲۱ جون ۱۹۵۶ء کو لاہور میں نابیناؤں کی
امدادی انجمن کے مشاعرے میں پڑھی گئی

وہی عالم ہے جو تم دیکھتے ہو
نہیں کچھ مختلف عالم ہمارا
جلائے ہم نے پلکوں پر دیے بھی
نہ چمکا پھر بھی قسمت کا ستارا
وہی ہے وقت کا بے نور دھارا

وہی سر پر مسلّط ہے شبِ غم
اندھیرے ہر طرف چھائے ہوئے ہیں
نہیں ملتی خوشی کی اک کرن بھی
مہ و خورشید گہنائے ہوئے ہیں
یہ کس بستی میں ہم آئے ہوئے ہیں

شکایت ہے تمہیں آنکھوں سے اپنی
یہاں آنکھیں کہاں روشن رفیقو
کلی کی آنکھ نم، روتی ہے شبنم
سلگتے ہیں گلوں کے تن رفیقو
نظر آتے ہیں گلشن بن رفیقو

جنھیں ہم شعر میں کہتے ہیں جادو
ان آنکھوں کو یہاں نم دیکھتے ہیں
لبوں پر آہ اور زلفیں پریشاں
غزل کو وقفِ ماتم دیکھتے ہیں
ستم کیا کم ہے یہ ہم دیکھتے ہیں

(۳۲)

احمد ریاض کی یاد میں

پہلے ہی اپنا کون تھا اے دوست
اب جو تو ہو گیا جُدا اے دوست

ساتھ کس نے دیا کسی کا یہاں
ساری دنیا ہے بے وفا اے دوست

تو جلا شمع کی طرح سرِ بزم
نور تھا تیرا ہم نوا اے دوست

کتنی خوش بخت ہے زمیں وہ بھی
اب جو دے گی ترا پتا اے دوست

یہ زمانہ ہے شعر کا دشمن
اس زمانے کا کیا گلا اے دوست

صبح آئے گی لے کے وہ خورشید
جس پہ تو ہو گیا فدا اے دوست

شہرِ ظلمات کو ثبات نہیں

اے نظامِ کہن کے فرزندو
اے شبِ تار کے جگر بندو

یہ شبِ تار جاوداں تو نہیں
یہ شبِ تار جانے والی ہے
تابکے تیرگی کے افسانے
صبحِ نو مسکرانے والی ہے

اے شبِ تار کے جگر گوشو
اے سحر دشمنو ستم کوشو

صبح کا آفتاب چمکے گا
ٹوٹ جائے گا جہل کا جادو
پھیل جائے گی ان دیاروں میں
علم و دانش کی روشنی ہر سُو

اے شبِ تار کے نگہبانو
شمعِ عہدِ زیاں کے پروانو
شہرِ ظلمات کے ثنا خوانو
شہرِ ظلمات کو ثبات نہیں
اور کچھ دیر صبح پر ہنس لو
اور کچھ دیر — کوئی بات نہیں

مستقبل

تیرے لیے میں کیا کیا صدمے سہتا ہوں
سنگینوں کے راج میں بھی سچ کہتا ہوں
میری راہ میں مصلحتوں کے پھول بھی ہیں
تیری خاطر کانٹے چُنتا رہتا ہوں
تُو آئے گا، اِسی آس پر جھُوم رہا ہے دل
دیکھ اے مستقبل

اک اک کر کے سارے ساتھی چھوڑ گئے
مجھ سے میرے رہبر بھی منہ موڑ گئے
سوچتا ہوں بیکار گلہ ہے غیروں کا
اپنے ہی جب پیار کا ناتا توڑ گئے
تیرے بھی دشمن ہیں میرے خوابوں کے قاتل
دیکھ اے مستقبل

جن کے آگے سر نہ جھکایا میں نے کبھی
سِفلوں کو اپنا نہ بنایا میں نے کبھی
دولت اور عُہدوں کے بل پر جو اینٹھیں
اُن لوگوں کو منہ نہ لگایا میں نے کبھی
میں نے چور کہا چوروں کو کھل کے سرِ محفل
دیکھ اے مستقبل



زُلف کی بات کیے جاتے ہیں
دن کو یوں رات کیے جاتے ہیں
چند آنسو ہیں، اُنھیں بھی جالب
نذرِ حالات کیے جاتے ہیں

نام کیا لوں

ایک عورت جو میرے لیے مدتوں
شمع کی طرح آنسو بہاتی رہی
میری خاطر زمانے سے منہ موڑ کر
میرے ہی پیار کے گیت گاتی رہی
میرے غم کو مقدر بنائے ہوئے
مسکراتی رہی

اُس کے غم کی کبھی میں نے پروا نہ کی
اُس نے ہر حال میں نام میرا لیا
چھین کر اُس کے ہونٹوں کی میں نے ہنسی
تیری دہلیز پہ اپنا سر رکھ دیا
تُو نے میری طرح میرا دل توڑ کر
مجھ پہ احسان کیا

یوری گیگرین

موت کے بیاباں سے زندگی گزر آئی
ظلمتوں کے صحرا میں روشنی نظر آئی

آدمی کی راہوں میں گرد ہیں مہ و انجم
ماورائے اِمکاں سے ہم کو یہ خبر آئی

صبح و شام لرزاں تھے سامنے نگاہوں کے
اہلِ دل کی منزل میں وہ بھی رہگزر آئی

جب سے دکھ زمانے کے ہمسفر بنائے ہیں
چھب مرے خیالوں کی اور بھی نکھر آئی

غُنچہ بہ غُنچہ، گُل بہ گُل، لالہ بہ لالہ بُو بہ بُو



مری نگاہ سے وہ دیکھتے رہے ہیں مجھے
رہا ہوں میں بھی کبھی اس نگاہ کا معیار
یہاں نہ تلخ نوائی سے کام لو جالب
رہینِ درد نہیں ہیں یہ بستیاں یہ دیار



اشک آنکھوں میں اب ہیں آئے سے
بات چھپتی نہیں چھپائے سے
اپنی باتیں کہیں تو کس سے کہیں
سب یہاں لوگ ہیں پرائے سے



نت نئے شہر نت نئی دنیا
ہم کو آوارگی سے پیار رہا
اُن کے آنے کے بعد بھی جالب
دیر تک ان کا انتظار رہا



کوچۂ صبح میں جا پہنچے ہم
صُورتِ موجِ صبا پہنچے ہم
نُزہتِ گل کا پیام آیا تھا
لاکھ تھے آبلہ پا، پہنچے ہم



تیری بستی میں جدھر سے گزُرے
ہائے کیا لوگ نظر سے گزرے
کتنی یادوں نے ہمیں تھام لیا
ہم جو اُس راہ گزر سے گزرے



سو گئے انجمِ شب یاد نہ آ
اے مری جانِ طرب یاد نہ آ
مری پتھرائی ہوئی آنکھوں میں
کوئی آنسو نہیں اب یاد نہ آ



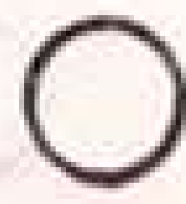
ڈوب جائے گا آج بھی خورشید
آج بھی تم نظر نہ آؤ گے
بیت جائے گی اس طرح ہر شام
زندگی بھر ہمیں رُلاؤ گے



غم کے سانچے میں ڈھل سکو تو چلو
تم مرے ساتھ چل سکو تو چلو
دُور تک تیرگی میں چلنا ہے
صورتِ شمع جل سکو تو چلو



دوستو مشورے نہ دو مجھ کو
مشوروں سے دماغ جلتا ہے
یہ کسی نے غلط کہا تم سے
اِن کھلونوں سے جی بہلتا ہے



جہاں آساں تھا دن کو رات کرنا
وہ گلیاں ہو گئی ہیں ایک سپنا
اب ان کی یاد ہے پلکوں پہ روشن
اب ان کو کہہ نہیں سکتے ہم اپنا



سبزہ زاروں میں گزر تھا اپنا
مست و شاداب نگر تھا اپنا
جب اُٹھاتا ہے کوئی محفل سے
یاد آتا ہے کہ گھر تھا اپنا



تجھے پایا کہ تجھ کو کھو دیا ہے
یہ اکثر سوچ کر دل رو دیا ہے
ہمارا داغِ دل جائے نہ جائے
ترا دامن تو ہم نے دھو دیا ہے



دیارِ سبزہ و گُل سے نکل کر
دل و جاں نذرِ صحرا ہو گئے ہیں
کہاں وہ چاند سی ہنستی جبینیں
گھنی تاریکیوں میں کھو گئے ہیں



مدّتیں ہو گئیں خطا کرتے
شرم آتی ہے اب دعا کرتے
چاند تارے بھی اُن کا اے جالب
تھرتھراتے ہیں سامنا کرتے



رنگ و بوئے گلاب کہہ لوں گا
موجِ جامِ شراب کہہ لوں گا
لوگ کہتے ہیں تیرا نام نہ لوں
میں تجھے ماہتاب کہہ لوں گا

مطبوعاتِ کارواں

نظم

کتاب	مصنف	پیسے	روپے
جاوید نامہ	مترجمہ نظیر لدھیانوی	00	6
خم کاکل (بشمول دور و دراز)	سیف الدین سیف	00	18
برگ نے	ناصر کاظمی	00	15
رم جھم	احمد ندیم قاسمی	50	12
زنداں نامہ	فیض احمد فیض	00	8
دست صبا	,, ,,	50	7
نقش فریادی	,, ,,	50	5
دست تہ سنگ	,, ,,	50	7
غبار تمنا	پروفیسر مرزا محمد منور	50	7
سراب وفا	سید عطا حسین کلیم	00	9
جلتی بجھتی آنکھیں (انعام یافتہ)	شہزاد احمد	00	10
ہزلیات (مزاحیہ غزلیات)	عاشق جالندھری	00	5
کلیات اصغر (گونڈوی)	مرتبہ یحییٰ امجد	00	10
زخم بہار	باقی صدیقی	00	5
برگ آوارہ	حبیب جالب	00	15
گوشے میں قفس کے	,, ,,	00	10
شام صحرا	حمید جالندھری	00	15
نوائے مشرق	علی اختر حیدرآبادی	00	10
کلیات غالب (بشمول نسخۂ حمیدیہ)		00	20
نقش چغتائی	(دیوان غالب مصور ایڈیشن)	00	25
گردش جام	سید عبدالحمید عدم	00	5
گلنار	,, ,,	00	5
شہر خوباں	,, ,,	00	5
بط مے	,, ,,	00	5
ساز و صدف	,, ,,	00	9
سرو و سمن	,, ,,	50	7
نقش دوام	,, ,,	50	7
آب رواں	,, ,,	00	6
خرابات	,, ,,	[illegible]	10
نگارستان	مولانا ظفر علی خاں	[illegible]	7
چمنستان	,, ,, زیرِ طبع	50	7
خیالستان	,, ,,	00	4
حبسیات	,, ,,	00	4
بہارستان	,, ,,	00	20